انداز بیان نہایت شگفتہ اور دلکش ہے، جابجا ادیبانہ شان پیدا ہوگئی ہے، ظرافت کی چاشنی نے اور لطف پیدا کر دیا ہے، مناظر قدرت کی مصوری بڑی شاعرانہ ہے، یہ سفرنامہ معلومات اور انداز بیان دونوں لحاظ سے مفید دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے،

حسرت کی سیاسی زندگی از جناب عبد القوی صاحب دسنوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲، صفحات، کاغذ، کتابت، وطباعت بہتر قیمت :- عہ، پتہ :- رائٹرس ایمپوریم لمیٹڈ پیومیس بلڈنگ نیر فروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی،

اس رسالہ میں حسرت کی زندگی کے سیاسی حالات لکھے گئے ہیں، اور اردوئے معلّیٰ اور حسرت کی شاعری سے نہ صرف اُن کے سیاسی خیالات کو دکھایا گیا ہے، بلکہ اُن کی سیاسی زندگی اور ہندوستان کی گذشتہ سیاسی تاریخ کے بہت سے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اگرچہ اس موضوع پر بعض او رمضامین بھی لکھے گئے ہیں، لیکن اُن کی شاعری سے ان کی سیاسی زندگی کے واقعات کی اتنی تفصیل کسی مضمون میں نہیں مل سکتی، انداز تحریر نہایت دلچسپ ہے، مصنف ابھی نوجوان ہیں، اُن کی اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کی اچھی صلاحیت ہے، اور آیندہ وہ اس راہ میں بہت ترقی کر سکتے ہیں،

جلد ۷۷ ماہ شوال المکرم ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ جون ۱۹۵۶ء عدد ۶

مضامین

شذرات

دنیائے اسلام جس طرح صدیوں مغربی طاقتوں کی استعماری سیاست کا شکار رہی، اس کی داستان بڑی دردناک اور طولانی ہے، اس زمانہ میں بھی جبکہ ایشیائی قوموں کی بیداری، مغربی حکومتوں کی باہمی رقابت، خصوصاً روس سے مسابقت کی بنا پر مشرق میں ان کی گرفت ڈھیلی پڑگئی ہے، انکی بنیادی پالیسی میں زیادہ فرق نہیں آیا ہے، اور جہاں ان کا بس چلتا ہے وہ پرانی جابرانہ سیاست پر اتر آتی ہیں جس کا تازہ ثبوت فرانس کے ہاتھوں الجزائر کے مسلمانوں کا قتل عام ہے، جس پر چنگیز و ہلاکو کی روح بھی شرمندہ ہوگی، مگر اب پرانا استعماری نظام قائم نہیں رہ سکتا، فرانس اپنی طاقت کے گھمنڈ میں جس قدر مظالم بھی چاہے کرلے، مگر ایک نہ ایک دن اس کو الجزائر سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

اس وقت امریکہ اور یورپ کی بڑی حکومتوں کی سیاست کا ایک بڑا محور مشرق وسطیٰ ہے، وہ یہاں اپنا اثر و نفوذ قائم رکھنے کے لیے مختلف تدبیروں سے کام لے رہی ہیں، مگر اب پرانی سیاست کامیاب نہیں ہوسکتی، اس لیے اس کی ظاہری شکل بدل دی گئی ہے، اور فوجی قوت کے بجائے معاشی و فوجی امداد اور دفاعی معاہدوں کا جال بچھایا گیا ہے، جس میں چھوٹی اور کمزور حکومتیں آسانی کے ساتھ پھنس جاتی ہیں، مگر اب عربی دنیا بیدار ہوچکی ہے، اسلیے یہ حربہ بھی زیادہ کارگر نہیں ہوسکتا، اگر کوئی حکومت کسی غرض یا مجبوری کی بنا پر اس جال میں پھنس بھی جائے تو ملک و قوم اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، جیسا کہ شرق اردن کے واقعات سے ظاہر ہے، جو تمامتر برطانیہ کا ساختہ و پرداختہ ہے، اور اگر ان امدادوں اور معاہدوں سے کسی حکومت کو عارضی فائدہ پہنچ بھی جائے تو اس سے عربی دنیا کو اتنا بڑا نقصان پہنچے گا جس کی تلافی دشوار ہوگی، اور جس کے اثر سے خود یہ حکومت بھی نہ بچ سکے گی، شریف حسین کی تاریخ نگاہ کے سامنے ہے، ان کی بغاوت کے صلہ میں گو عراق اور شرق اردن میں ان کی اولاد کی ریاستیں قائم ہوگئیں، مگر عربی دنیا کے ٹکڑے اڑ گئے، اور عربی وحدت پارہ پارہ ہوگئی، اور آج عرب حکومتوں میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ

اسی کے مذموم نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے، اسرائیل کی بلا الگ عربوں پر مسلط ہوگئی، جو عربی دنیا کیلیے ایک مستقل خطرہ ہے، اس حکومت کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ عربوں کے سر پر ایک ایسی طاقت مسلط کردیجائے کہ وہ مغربی حکومتوں کے مقابلہ میں سر نہ اٹھا سکیں، اگر اب بھی عرب حکومتوں میں اختلاف قائم رہا تو اس کے اور بھی برے نتائج نکلیں گے۔

مگر یہ اطمینان کا باعث ہے کہ عربی دنیا کی قیادت مصری اور سعودی حکومتوں کے ہاتھوں میں ہے، جو ایک حد تک مغربی حکومتوں کی معاشی امداد سے مستغنی اور ان کے ہتھکنڈوں سے پوری طرح واقف ہیں، مصر تو ایک ترقی یافتہ حکومت ہے، بشرطیکہ اس کا اندرونی اختلاف اس کو کمزور نہ کردے، سعودی حکومت بھی ہر شعبہ میں ترقی کی کوشش کر رہی ہے، اس کے پاس دولت کی کمی نہیں، اس سے صحیح طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، مرحوم سلطان عبد العزیز بڑے مدبر اور بیدار مغز تھے، انھوں نے مختلف حیثیتوں سے حکومت کو مضبوط اور طاقتور بنانے کی کوشش کی، ان کے جانشین سلطان سعود بن عبد العزیز بھی ہوشمند، حالات زمانہ سے باخبر اور ترقی پسند حکمران ہیں، ان کے دور میں ترقی کی رفتار اور زیادہ تیز ہوگئی ہے، اس کو دیکھکر یقین ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں سعودی حکومت ایک طاقتور اور ترقی یافتہ حکومت بنجائیگی، ان دونوں حکومتوں کی موجودگی میں مشرق وسطیٰ میں مغربی حکومتوں کے منصوبے پورے نہیں ہوسکتے،

حجاز دنیائے اسلام کا دینی و روحانی مرکز ہے، اور تمام اسلامی حکومتیں اس کی خدمت باعث سعادت سمجھتی رہی ہیں، مگر یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ ان حکومتوں نے بھی اس کی دنیاوی ترقی کی جانب توجہ نہیں کی جو حرمین کی خادم تھیں، ترکوں کو صدیوں تک یہ سعادت حاصل رہی، وہ حرمین کا بڑا احترام اور اس پر بے دریغ دولت صرف کرتے تھے، مگر حجاز اور اہل حجاز کی صحیح خدمت اور ان کی اصلاح و ترقی سے انھوں نے بھی بڑی غفلت برتی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیائے اسلام کا یہ مرکز معاشی، علمی اور تعلیمی ہر حیثیت سے ایک پسماندہ علاقہ بن گیا، اور شریف حسین کے زمانہ میں تو زوال و انحطاط کے انتہائی حدود کو پہنچ گیا، اور اس کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید و اصلاح کی سعادت آل سعود کے حصہ میں آئی، اور سعودی حکومت کے قیام کے بعد سلطان عبد العزیز آل سعود نے حکومت کے استحکام و ترقی، دینی تجدید و اصلاح، قیام شریعت اور حجاز و اہل حجاز کی دنیاوی صلاح و فلاح ہر پہلو کیجانب توجہ کی، جس کے نتائج آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس حکومت سے پہلے حجاز کی تعلیمی حالت اس قدر پست اور محدود تھی کہ حاجیوں کے بیانات کے علاوہ وہاں کے حالات معلوم کرنے کا اور کوئی مستند ذریعہ نہ تھا، سعودی حکومت کے زمانہ میں علمی و تعلیمی ترقی کے ساتھ علمی و تصنیفی ذوق اور نشر و اشاعت کے وسائل میں بھی وسعت پیدا ہوئی، حکومت کے شعبۂ نشر و اشاعت کے علاوہ مختلف مصنفین، اہل قلم اور اداروں کی جانب سے ایسی کتابیں نکلتی رہتی ہیں جن سے سلطان کے کارناموں اور حکومت حجاز کے حالات آسانی سے معلوم ہو سکتے ہیں، مثلاً (۱) الامام العادل یہ سعودی حکومت کے وزیر سیاسیات سید عبد الحمید الخطیب کے قلم سے دو جلدوں میں سلطان عبد العزیز کی مفصل سوانح عمری ہے (۲) صقر الجزیرہ، یہ بھی تین جلدوں میں سلطان کی مبسوط سوانح عمری ہے، اس کے مصنف استاذ احمد عبد الغفور عطار ہیں، ان دونوں کتابوں سے سلطان کے کارناموں اور حکومت حجاز کے پورے حالات معلوم ہو جاتے ہیں، (۳) مملکۃ فی المیزان، یہ سعودی حکومت کے متعلق ایک مصری صحافی محمد السوادی کے تاثرات ہیں، جنھوں نے سعودی عرب کا دورہ کر کے اپنی آنکھوں سے حالات کا مشاہدہ کیا تھا (۴) طلبۃ البعثات السعودیہ، یہ سعودی عرب کے ان طلبہ کے مضامین کا مجموعہ ہے جو حکومت کی جانب سے حصول تعلیم کے لیے مصر بھیجے گئے، یہ مضامین مختلف علمی، تعلیمی اور ادبی موضوعوں پر ہیں، جن سے طلبہ کی استعداد کے ساتھ سعودی حکومت کی تعلیمی ترقی کے حالات بھی معلوم ہوتے ہیں،

حکمراں و حکومت سے متعلق کتابوں کے علاوہ مختلف اداروں سے مفید اور سنجیدہ علمی کتابیں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں، چنانچہ حال میں مکہ مکرمہ کے مکتبۃ الثقافۃ نے مکہ کی ایک مبسوط تاریخ تاریخ مکہ شائع کی ہے جو عہد اسمٰعیلی سے لیکر شریف حسین کے زمانہ تک کے مفصل سیاسی، علمی، اجتماعی اور عمرانی تاریخ پر مشتمل ہے، اس کے مصنف استاذ احمد السباعی ہیں، یہ بڑی اہم کتاب ہے، غالباً اس کی دوسری جلد بھی ہوگی جس میں اس کے بعد کے حالات ہوں گے، مدینہ منورہ کے مکتبۃ الفقیہ نے معالم الہجرۃ کے نام سے مدینہ منورہ کی ایک تاریخ شائع کی ہے، اس کے مصنف یوسف عبد الرزاق ہیں، اس میں مدینہ منورہ اور اس کے مشاہد کی تاریخ اور اس کے فضائل وغیرہ ہیں، اس سلسلہ میں عہد نبوی کے حالات بھی آ گئے ہیں، لجنۃ النشر العربیہ نے علامہ قطب الدین حنفی المتوفی ۹۹۰ھ کی کتاب اعلام الاعلام باخبار مسجد الحرام کی تلخیص بلد الحرام ملخصہ علامہ عبد الکریم حنفی شائع کی ہے، اس کے علاوہ اور بھی مفید کتابیں ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

شذرات کی کاپی لکھی جا چکی تھی کہ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملی، حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد علمی و مذہبی دنیا کا یہ دوسرا بڑا حادثہ ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ، اس پر آئندہ مہینہ مفصل لکھا جائیگا۔

مقالات

اسلامی قانون اجرت کا ایک باب

از جناب مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

موجودہ مادی دور میں جن اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کا کوئی معتدل اور متوازن حل ابتک دنیا تلاش نہیں کر سکی ہے، ان میں ایک مسئلہ اجرت بھی ہے،

اس وقت پوری دنیا دو نظاموں میں بٹی ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا حصہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کا حامی ہے، اور دوسرا کمیونزم یا سوشلزم کا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا ایک حصہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کا شکار ہے اور دوسرا اس کے ردعمل کا تجربہ کر رہا ہے، مگر ان دونوں نظاموں میں مزدوروں کی حیثیت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے، اگر ان پر سرمایہ دارانہ جمہوریت میں سرمایہ داروں کی اجارہ داری کی وجہ سے ظلم و تشدد ہوتا تھا تو کمیونزم کی مجبورانہ اور اسٹیٹ کنٹرول پالیسی میں اس سے کچھ زیادہ ظلم ہو رہا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جمہوری ملکوں میں انھیں احتجاج، مظاہرہ، اسٹرائک اور پیشہ کی تبدیلی کا حق اور آزادی حاصل ہے، اس لیے وہ ان ذرائع سے اپنے جذبات کی کچھ تسکین بھی کر لیتے ہیں، اور کچھ اپنے حقوق بھی منوا لیتے ہیں، اگر کمیونسٹ ملکوں میں چونکہ ان کو ان میں سے کوئی حق حاصل نہیں ہے، اس لیے وہ گھٹ گھٹ کر اپنی صلاحیتوں اور اپنے احساسات کا خون کرتے رہتے ہیں، اس لیے بسا اوقات بادی النظر میں

کمیونسٹ ملکوں کے مزدوروں کی تکلیفوں کا پتہ لگانا بھی دشوار ہوتا ہے،

پھر یہ دونوں نظام اس حیثیت سے بھی ناقص ہیں کہ وہ مزدوروں کی محض مادی ضرورتوں اور احتیاجوں کا تو کچھ نہ کچھ بند و بست کرتے ہیں، مگر وہ اجرت کے مسئلہ کو اس حیثیت سے نہیں دیکھتے کہ مزدور محض مادی ضرورتوں اور احتیاجوں ہی کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک انسان ہے، جس کے سینے میں بھی دل ہے، اور عام انسانوں کی طرح اس کے دل میں بھی کچھ ایسے جذبات اور احساسات پیدا ہوتے ہیں جن کی وہ تسکین چاہتا ہے، معاشی ضرورتوں کے علاوہ اس کی کچھ معاشرتی، اخلاقی اور داخلی ضرورتیں بھی ہیں جن کی وہ تکمیل چاہتا ہے، یہ محض اسلامی نظام اور اس کے قانون اجرت کی خصوصیت ہے کہ وہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل ہے، وہ ایک طرف اجیروں کی مادی ضرورتوں اور مشکلوں کا حل پیش کرتا ہے تو دوسری طرف ان کے معاشرتی اور اخلاقی احساسات اور احتیاجات کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے، غرض یہ کہ اجرت کے سلسلہ کی ہر طرح کی مشکلوں اور دقتوں کا کوئی متوازن اور معتدل حل اگر کسی نظام میں موجود ہے تو صرف اسلامی نظام میں۔

اس موضوع پر راقم نے ایک کتاب "اسلامی قانون اجرت" کے نام سے مرتب کی ہے جس کا وہ حصہ اس مضمون میں طوالت کے خیال سے حذف کر دیا گیا ہے جس میں موجودہ نظام اجرت پر تنقید کر کے اس کی معاشی خامیوں اور قانونی و اخلاقی کمزوریوں کو دکھلایا گیا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ کہیں کہیں پر ناظرین کو اس میں کمی یا کسی بات کی وضاحت میں تشنگی محسوس ہو۔

محنت کی عزت افزائی

انسان اپنی روزی کمانے کے لیے جو اور جیسی بھی محنت کرے خواہ وہ جسمانی ہو یا دماغی اسلام اس کی اجازت دیتا ہے اور اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ محنت کرنے پر ابھارتا ہے اور جو لوگ اپنا پسینہ بہا کر اپنی روزی حاصل کرتے ہیں، ان کو عزت کی نگاہ سے

دیکھتا ہے، اور ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے، جو بغیر محنت کے یا دوسروں کے سہارے اپنا پیٹ پالتے ہیں، خصوصیت سے جسمانی اور معمولی محنت کے کام کرنے والوں کو جنھیں آج کی تہذیب دنیا میں بھی معاشرہ میں وہ بلند مقام حاصل نہیں ہے جو دوسرے طبقوں کو حاصل ہے، اسلام انکو وہی مقام عطا کرتا ہے جو مملکت کی بڑی سے بڑی شخصیت کو حاصل ہوتا ہے اور یہ حق ان کو محض نظری اور قانونی طور پر نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسلام کے اصلی نمائندوں نے اپنے عمل اور اپنی سیرت سے اس کا ثبوت دیا ہے، انبیائے کرام جو اپنے اخلاق و کردار اور عزت و شرافت کے اعتبار سے پوری انسانیت کا جوہر ہیں، انھوں نے خود محنت اور مزدوری کی ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کمائی ہے، دوسروں کی بکریاں چرا کر اور گلہ بانی کر کے اپنی قوت لایموت کا سامان کیا ہے، آج انبیائے کرام کے ماننے والے پیشہ اور محنت و مزدوری کو ذلیل چیز شمار کرتے ہیں، مگر انبیائے کرام کی سیرت میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ وہ مزدوری کرنے والوں کے ہاتھ کے گھٹے کو خوش ہو کر بوسہ دیتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ اسلام نے محنت کو بے لگام نہیں چھوڑ دیا، وہ پیشہ محنت اور مزدوری میں آزادی کا قائل ہے، مگر اس کے ساتھ ایسی محنتوں پر وہ پابندی بھی لگاتا ہے جو معاشی یا اخلاقی حیثیت سے معاشرہ کے لیے مضر ہوں، اس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، اسلام انسان کو کچھ پائیدار اور مستقل اخلاقی قدریں دیتا ہے، اور ان قدروں کی پامالی وہ کسی حال میں پسند نہیں کرتا، چونکہ وہ معاش کو بھی ان قدروں کا پابند بنانا چاہتا ہے، اس لیے وہ نہ تو مغرب کی بے قید معیشت اور محنت کی اس بے قید تعریف کو تسلیم کرتا ہے کہ "جس کام سے آدمی کو مادی یا غیر مادی معاوضہ حاصل ہو وہ محنت بار آور ہے"[1] اور نہ اشتراکیت کی بے اخلاق جبری محنت کو پسند کرتا ہے، بلکہ اسلام صرف اس محنت کو بار آور محنت کہتا ہے جو اجرت و منفعت

---

[1] مسٹر تاسگ ج ۱ ص ۲۳

کے اعتبار سے تو آزاد ہو، مگر اس کی آزادی اخلاقی حدود کے اندر ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات محنت کی عزت افزائی کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

ما اکل احد طعاما قط خیرا	اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہے جو آدمی
من ان یاکل من عمل یدیہ	اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاتا ہے حضرت
وان نبی اللہ داؤد علیہ السلام	داؤدؑ اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی
کان یاکل من عمل یدیہ[1]	کماتے تھے۔

اس طرح حضرت موسیٰؑ کا ذکر کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

أجر نفسہ ثمان سنین او عشرا	انھوں نے آٹھ یا دس برس تک اس طرح مزدوری
علی عفۃ فرجہ وطعامہ[2]	کی کہ اس پوری مدت میں وہ پاک دامن رہے،

یہ حدیث قرآن مجید کے دو لفظ "القوی الامین" کی گویا تفسیر ہے، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک مزدور میں اخلاقی اوصاف کیا ہونے چاہئیں، اس کی تفصیل آگے آئے گی، آپ نے ان چند انبیائے کرام ہی کا اسوہ پیش نہیں کیا بلکہ ایک حدیث میں فرمایا

ما بعث اللہ نبیا الا رعی	خدا نے جتنے انبیا بھیجے ہیں ان سب نے
الغنم[3]	بکریاں چرائی ہیں؛

صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں، فرمایا:

نعم کنت ارعی علی قراریط	ہاں میں بھی چند قیراطوں کے عوض اہل مکہ
لاھل مکۃ[4]	کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

[1] بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب الکسب [2] ایضاً باب الاجارۃ [3] مشکوٰۃ باب الاجارہ [4] ایضاً

ایک صحابی نے آپ سے پوچھا کہ

ای الکسب اطیب قال عمل	کون سی کمائی سب سے زیادہ پاکیزہ ہے، آپ نے
الرجل بیدہ[1]	فرمایا کہ اپنی محنت کی کمائی،

حدیث میں ہے کہ ایک انصاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دست سوال دراز کیا، آپ نے ان سے پوچھا، تمھارے پاس کوئی سامان ہے، فرمایا ایک کمبل اور ایک پانی پینے کا پیالہ ہے، فرمایا اسے لے آؤ، وہ لے آئے، آپ نے صحابہ سے دریافت فرمایا اسکو کون خریدتا ہے، ایک صحابی نے اس کی قیمت ایک درہم لگائی، آپ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ کوئی قیمت دے سکتا ہے، ایک دوسرے صحابی دو درہم قیمت دینے پر آمادہ ہوگئے، آپ نے یہ چیزیں ان کے حوالہ کیں اور دو درہم ان سے لیکر انصاری کو دیدیے کہ ایک درہم کی کلہاڑی لے آؤ اور ایک درہم کا غلہ خرید کر گھر میں رکھدو، انھوں نے اس کی تعمیل کی، جب وہ کلہاڑی لے کر آئے تو حضور نے اپنے دست مبارک سے اس میں بینٹ لگائی اور ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ جاؤ اس سے لکڑی کاٹ کاٹ کر بیچو، پندرہ دن تک تم میرے پاس نہ آنا، پندرہ دن کے بعد جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو پوچھا کیا حال ہے، عرض کیا اس عرصہ میں میں نے دس درہم کمائے ہیں، جن میں چند درہم کے کپڑے خریدے ہیں اور چند درہم سے غلہ وغیرہ، آپ نے فرمایا کہ بھیک مانگ کر قیامت کے دن ذلت اٹھانے سے یہ بہتر نہیں ہے؟[2]

بھاؤڑا چلاتے چلاتے ایک صحابی کے ہاتھوں میں نیل پڑ گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو پوچھا، تمھارے ہاتھوں پر کچھ لکھا ہوا ہے، بولے نہیں، پتھر پر بھاؤڑا چلاتا ہوں اور اس سے اپنے اہل وعیال کی روزی کماتا ہوں، آپ نے ان کے ہاتھ چوم لیے،

[1] بخاری [2] ترمذی، ابوداؤد

پیشہ کی حقارت کو مٹانے کے لیے آپ خود اس کا عملی نمونہ پیش فرماتے تھے، ایک بار کوئی دستی کام کیا، اور مسلمانوں کو بھی اس کی ترغیب دی، لیکن مسلمان اس سے الگ رہے، آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کے لیے مخصوص خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ "لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسے کام سے الگ رہتے ہیں جس کو میں خود کرتا ہوں، خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا کا خوف رکھتا ہوں[1]"

اس واقعہ میں ان مسلمانوں کے لیے سبق ہے جو اپنے ہاتھ سے کام کرنا عزت کے خلاف سمجھتے ہیں،

فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ایک توانا تندرست نوجوان یہ کہتا ہوا مسجد نبویؐ میں داخل ہوا کہ جہاد کرنے میں کون میری مدد کرتا ہے، حضرت فاروقؓ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اپنی زمین میں کام لینے کے لیے اس شخص کو کون مزدوری پر رکھتا ہے، ایک انصاری بولے میں، آپ نے پوچھا، تم اس کو ماہانہ کتنی اجرت دوگے، انھوں نے اجرت بتائی، فرمایا اس کو لیجاؤ اور کام لو۔

چند مہینے بعد حضرت عمرؓ نے انصاری سے پوچھا کہ مزدور کا کیا حال ہے، انھوں نے کہا ٹھیک ہے، آپ نے حکم دیا کہ اسے جمع شدہ اجرت کے ساتھ میرے پاس لاؤ، چنانچہ وہ مزدور درہموں سے بھری ہوئی ایک تھیلی کے ساتھ آپ کے سامنے لایا گیا، آپ نے اس سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ لو یہ تھیلی، اب جی چاہے جہاد کرو یا جی چاہے گھر بیٹھو[2]،

اسلام نے جو ذہنیت پیدا کی تھی، اس کی وجہ سے اس زمانہ میں کوئی شخص بھی بیکار رہنا پسند نہیں کرتا تھا، چنانچہ صحابہ میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو کوئی نہ کوئی پیشہ نہ کرتے ہوں،

---

[1] معاشی نظریے ج ۱ ص ۲۱۴ [2] کنز العمال ج ۲ ص ۲۱۶

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں یہ عام جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ کسی پر اپنا معاشی بار ڈالنا پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ جب صحابہ کی ایک جماعت مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ گئی تو انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ آپ ان کی جائدادوں کو ان کے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم فرما دیں، آپ نے فرمایا کہ نہیں مہاجرین سے تم یہ کہو کہ

فتکفونا المؤنته ونشرککم فی الثمرة قالو سمعنا واطعنا[1]	تم محنت کرو ہم پیداوار میں تم کو شریک کریں گے،

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی تندرست آدمی کو دیکھتا ہوں تو دریافت کرتا ہوں کہ وہ کوئی پیشہ کرتا ہے یا نہیں، اگر وہ کہتا ہے کہ میں بیکار ہوں تو میری نظر سے گر جاتا ہے، آپ مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے تھے کہ

لاتکونوا عیالا علی المسلمین[2]	مسلمانوں پر بار نہ بنو،

مگر اسی کے ساتھ اسلام یہ پابندی بھی عائد کرتا ہے کہ کسی ایسے پیشہ یا کام سے روزی نہ کمائی جائے جو اخلاقی اعتبار سے معاشرہ کے لیے مضر ہو، اس کے لیے اسلام نے حرام و حلال کی حد بنا دی ہے، جو معاش کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، خواہ تجارت ہو یا زراعت، صنعت ہو یا اجرت و محنت، اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے، قرآن مجید نے کسب معاش کے ان تمام ذرائع اور طریقوں کو جو حلال و حرام کی تمیز کے بغیر اختیار کیے جاتے ہیں، ناجائز اکل بالباطل قرار دیا ہے، اور ان کی نشاندہی بھی کر دی ہے، اور اس کی پوری تفصیل آنحضرتؐ کے ارشادات میں ملتی ہے، ہم ان ارشادات کو یہاں نقل کرتے ہیں جو محنت و اجرت سے متعلق ہیں،

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۳۱۲ [2] معاشی نظریے ص ۲۵۹

آپ نے فرمایا "حلال کی کمائی اسلام کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے[1]"، چنانچہ مسلمانوں کو شراب کی تجارت سے روکتا ہے، اس میں جو لوگ اجرت پر کام کرتے ہیں ان کو بھی اس سے روکتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

شراب کا پینا، پلانا، بیچنا، خریدنا، اس کی کشید کرنا، اس کی باربرداری کرنا سب حرام ہے۔

یعنی کوئی شخص شراب کا کاروبار ہی نہیں بلکہ اس میں اجرت اور محنت پر کام کرتا ہے تو بھی اخلاقی اور قانونی دونوں اعتبار سے جرم ہے۔ اسی طرح سودی کاروبار، سٹے بازی اور ان تمام تفریحی کاروبار کو جن سے بداخلاقی پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے، مثلاً تھیٹر، سینما وغیرہ کی اجازت نہیں دیتا، حتی کہ اگر کوئی شخص ان ذرائع سے روپیہ کما کر اس کی زکوٰۃ و خیرات بھی کرے تو خدا کے یہاں وہ مقبول نہ ہوگی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی حرام ذریعہ سے پیسہ پیدا کرے، اور صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول نہیں ہوگا۔

اسی طرح ان محنتوں کو بھی وہ بار آور قرار نہیں دیتا جن سے توہم پرستی، تنگ بندی یا انسان کے بارے میں خدائی کا کوئی تصور پیدا ہو، مثلاً کہانت، رمل، غیب دانی، گنڈے، تعویذ اور قبروں کی مجاوری کو بطور پیشہ اختیار کرنے کو ممنوع قرار دیتا ہے،

مزدوروں پر ظلم موجودہ دور میں مزدوروں کی حق تلفی، ان پر ظلم و زیادتی کی جو عام شکایت ہے اس کا سلسلہ بہت قدیم ہے، اگر اسلام سے قبل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، تو محنت کش طبقہ اور مزدوروں کی حالت جانوروں سے بدتر نظر آئے گی، بعثت نبوی سے پہلے دنیا میں بڑے بڑے انسانیت دوست مذاہب موجود تھے، اور بڑی بڑی متمدن سلطنتیں بھی تھیں، مگر اس طبقہ کو کسی نے اس کا حق دلانے کی کوشش نہیں کی، ہندومت میں محنت کش طبقہ کے ساتھ

[1] معاشی نظریہ ص ۲۵۹

جو سلوک روا رکھا، اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، اس کا مشاہدہ آج بھی کیا جا سکتا ہے، اس نے پیشہ ور اور محنت کش طبقہ کو ہزاروں برس سے سماج میں جو مقام دے رکھا ہے وہ سب کو معلوم ہے، اور ہندوؤں کی ایسی کوئی کتاب نہیں ہے جس میں اس کا ذکر نہ ہو چنانچہ منوسمرتی میں بھی بعض پیشوں کا ذکر ہے جن کو ناپاک قرار دیا گیا ہے، مثلاً "بڑھئی، اوید، درزی، سنار، لوہار، رنگریز، دھوبی، معمار، ان کے ساتھ کھانا کھانے سے اتنی تکلیف ہوتی ہے جتنی کہ بال اور ہڈی کے کھانے سے[1]"۔

یہودیت و عیسائیت الہامی مذاہب ہیں، اس لیے ان میں انسان کے کسی طبقہ کے ساتھ ظلم و ستم اور ان کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی تعلیم نہ ہونی چاہیے تھی، مگر یہودیوں نے اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے تحت محنت کش طبقہ کے بارے میں جو اصول اپنے مذہب میں داخل کر دیئے ہیں وہ ایک الہامی مذہب کے لیے بدنما داغ بھی ہیں اور عبرت خیز بھی، یہودی بائبل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"اگر کوئی مالک اپنے خادم یا ملازم کو زدوکوب کرے، اور وہ فوراً مر جائے تو مالک کو سزا دی جائے گی، لیکن اگر وہ بدقسمتی سے کچھ دن زندہ رہ گیا تو پھر اس کو کوئی سزا نہ دی جائے گی، اس لیے کہ وہ ملازم اس کا مال ہے[2]"۔

اگر آقا اپنے ملازم کی شادی کر دے اور اس سے بچے پیدا ہوں تو وہ آقا کی ملک ہونگے، اگر وہ مطالبہ کرے تو عدالت کا فرض ہے کہ اس کے کان میں سوا چھید کر اس کو دروازہ میں گھسا دے کہ وہ اس طرح ہمیشہ اس کی خدمت کرے[3]۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوری زندگی خدائی بادشاہت کی دعوت دینے اور رحمت و شفقت

[1] منوسمرتی ادھیائے ۴، منتر ۲۱۳ ص ۱۵۴ بحوالہ معاشی نظریہ ص ۱۱۴ [2] بائبل ہجرت باب ۲۱-۲۲ [3] ایضاً

اور مساوات کا وعظ کہتے رہے، مگر ان کی وفات کے بعد ان کے ماننے والوں اور سینٹ پال نے جو عیسائیت دنیا کے سامنے پیش کی اس میں اس کی یہ تعلیم ہے،

مزدور، اور ملازم اس قابل نہیں کہ ان کا شکریہ ادا کیا جائے[1]، اور خدائی بادشاہت کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ

گھر بار بیوی بچے اور پیشہ کو چھوڑ دے. جو کوئی اپنا ہاتھ ہل پر رکھکر پیچھے دیکھتا ہے وہ خدا کی بادشاہت کے لائق نہیں ہے.[2]

یہ تو دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کی تعلیم تھی، اس زمانہ کی سیاسی دنیا میں اس طبقہ کی جو حالت تھی اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے،

بعثت نبوی کے وقت مصر میں رومیوں کی ایک متمدن اور ترقی یافتہ سلطنت تھی، مگر وہاں اس طبقہ کی جو حالت تھی اس کی تصویر مصر کے پہلے گورنر عمرو بن العاصؓ نے ان الفاظ میں کھینچی ہے،

ایک مخلوق جس پر خدا کی مہربانی ہے، اور جو شہد کی طرح دوسروں کے لیے محنت کرتی ہے اور اپنی محنت اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی.[3]

ایران اور روم میں بھی اس طبقہ کی حالت رومی مصر سے بہتر نہیں تھی، حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ مجھے ظلماً لوگوں نے غلام بنا لیا تھا، اور میں دس سے زیادہ مالکوں کے پاس دست بدست منتقل ہوتا رہا،[4]

ایک مغربی مصنف لکھتا ہے

---

[1] انجیل لوقا باب ۱۷، [2] ایضاً باب ۱۶ ص ۹۰ و [3] تمدن عرب ص ۲۰۱ مترجمہ سید علی بلگرامی

[4] بخاری تذکرۂ اسلام سلمان فارسی

یہی حال قدیم رومیوں کا تھا، قدیم مصریوں کے ہاں پیشہ وروں کو خصوصاً گلا بانوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا، اور وہ ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے.[1]

یونان جو تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکا ہے، اس کا نفس ناطقہ ارسطو کہتا تھا کہ

وحشی یعنی غیر یونانی غلام بننے کے لیے پیدا ہوتے ہیں"

اس نے سکندر کو مشورہ دیا تھا کہ

وہ یونانیوں کا قائد اور وحشیوں یعنی غیر یونانیوں کا آقا کہلائے، اول الذکر کے ساتھ دوستوں اور رشتہ داروں کا اور ثانی الذکر کے ساتھ درندوں اور وحشوں کا برتاؤ کرے[2]

جزیرۂ عرب میں اس وقت نہ تو کوئی سیاسی مرکزیت تھی اور نہ تمدنی اعتبار سے وہاں کے باشندے کوئی ممتاز حیثیت رکھتے تھے، تاہم وہاں کے بھی اس طبقہ کی زبوں حالی کے دو چار واقعے سن لیجئے، تاکہ اس کا اندازہ ہو سکے کہ اسلام نے اس طبقہ پر کیا احسانات کیے ہیں اور اس کو زندگی کی پستی سے نکال کر بلندی کے کس درجہ تک پہنچایا ہے،

بعثت نبوی سے پہلے ساری دنیا میں اور خاص طور سے عرب میں غلامی کی رسم جاری تھی، وہی لوگ غلام نہیں بنائے جاتے تھے، جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آتے تھے، بلکہ جو بھی اجنبی، بے وسیلہ اور بے سہارا آدمی مل جاتا تھا، اسے اپنی ملک بنا لیتے، اس پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا تھا، حضرت سلمانؓ کا بیان اوپر گذر چکا ہے، کہ وہ اسی طرح دس آدمیوں کی غلامی میں رہے، حدیثوں میں اس طرح کے اور واقعات بھی ملتے ہیں، مثلاً ایک واقعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے،

---

[1] ہوٹن اکنامک لائف آف دی اینشنٹ ورلڈ باب ص ۸، [2] سیاسی نظریے ج ۱، ص ۱۳، [3] ایضاً

ایک ہاشمی کو قریش کے کسی شخص نے اجرت پر رکھا، وہ دونوں کہیں جا رہے تھے، اتفاق سے ایک اور ہاشمی کا ادھر سے گذر ہوا، اس نے اونٹ باندھنے کے لیے ڈوری مانگی، اور اس نے دیدی، اور منزل پر تمام اونٹ تو باندھ دیے گئے، مگر ایک اونٹ کھلا رہ گیا، آجر نے پوچھا ایک اونٹ کیوں کھلا ہے، مزدور نے کہا کہ اس کی ڈوری نہیں ہے، اس پر وہ قریشی آجر بہت برہم ہوا، اور مزدور کو اس قدر مارا کہ مر گیا، جب وہ مکہ واپس پہنچا، اور لوگوں نے مزدور کا حال دریافت کیا، اس نے اس کی موت کی اطلاع دی،[1]

یہ خاندان بنو ہاشم کا مزدور تھا، جو مکہ میں سب سے ممتاز تھا، جس کو ایک رسی کے لیے قتل کر دیا گیا، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان بے سہارا اور بے وسیلہ مزدوروں اور غلاموں کی کیا قدر و قیمت رہی ہوگی،

اس طبقہ پر اسلام کا احسان بعثت نبوی سے پہلے اور اس ترقی یافتہ دور میں مزدوروں اور محنت پیشہ طبقہ کی حالت کا جو نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اس طبقہ کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے وہ سب اسلام ہی کا فیض ہے۔

اوپر محنت مزدوری اور اس طبقہ کی عزت افزائی کا ذکر کیا جا چکا ہے، اب سیرت نبوی اور اسوۂ صحابہ کے چند واقعات اور درج کیے جاتے ہیں، جس سے اس کی مزید تفصیل معلوم ہوگی۔

حضرت موسیٰؑ کو حضرت شعیبؑ نے جب بکریاں چرانے کے لیے اجرت پر رکھا تو ان سے ساتھ یہ بھی فرمایا "میں تم پر کوئی سختی نہیں کروں گا"،

حضرت موسیٰؑ نے بھی جواب میں کہا "مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے"۔

[1] بخاری باب القسامت۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجیر کے ساتھ ظلم و زیادتی ایک قدیم روایت ہے، جسے کسی آسمانی مذہب اور نبی نے پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ اپنے اسوہ سے اس کو مٹایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اجیروں، اپنے خادموں اور ملازموں کے ساتھ جو مساویانہ سلوک کرتے تھے، اسکی مثال دنیا کی کسی بڑی شخصیت میں نہیں مل سکتی، ایک طرف تو مزدور طبقہ کو ناپاک، کمتر اور مملوک اور ناقابل التفات سمجھا جاتا ہے، دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ سارے انسان بھائی بھائی ہیں"، ایک حدیث میں ہے

هم اخوانكم جعلهم الله تحت ايديكم فمن جعله الله اخاه تحت يده فليطعمه مما ياكل وليلبسه مما يلبس ويكلفه من العمل ما يغلبه فان كلفه فليعنه[1]	ملازم اور مزدور تمہارے بھائی ہیں، خدا نے انھیں تمہارا ماتحت بنایا ہے تو خدا نے جس کے تحت ان کے کسی بھائی کو کیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ خود جو کھائے وہی اس کو کھلائے اور خود جو پہنے وہی اسکو پہنائے اور اس سے ایسا سخت کام نہ لے جو اس کو نڈھال کر دے، اگر سخت کام لینا ہو تو خود بھی اسمیں شریک ہو کر اسکی مدد کرے،

آخرت میں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوں گے ان میں ایک وہ شخص بھی ہے

رجل استاجر اجیرا فاستوفی منه ولم يعطه اجره	جس نے کسی مزدور کو مزدوری پر رکھا پھر اس سے پورا پورا کام لیا اور اس کی مزدوری مار بیٹھا

[1] بخاری کتاب الایمان باب امر الجاہلیۃ

آپ نے ادائیگی اجرت کے بارے میں فرمایا کہ

اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ — مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس تعلیم کا عملی نمونہ تھی، آپ نے اپنے ذاتی ملازموں، خادموں اور مزدوروں سے کبھی نابرابری کا سلوک نہیں کیا۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں دس برس تک آپ کی خدمت میں رہا، مگر آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا اور کیوں نہیں کیا،

اسلامی تعلیم کا اثر اسلام کی اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ عرب کے وہ لوگ جو جاہلیت میں غلاموں، ملازموں اور مزدوروں کے ساتھ چوپایوں جیسا سلوک کرتے تھے، انھوں نے ان کو اپنا بھائی بنا کر گلے سے لگا لیا، جو خود کھایا وہ ان کو کھلایا، جو خود پہنا وہ ان کو پہنایا، اور جو اپنے لیے پسند کیا، ان کے لیے پسند کیا، اس کے کچھ واقعات ملاحظہ ہوں، اس زمانہ میں موجودہ مزدوروں کے بجائے زیادہ تر غلام یا ذاتی ملازم تھے، اس لیے یہ واقعات ان ہی سے متعلق ہیں،

ایک بار حضرت ابوذر غفاریؓ ایک عمدہ چادر اوڑھے ہوئے تھے، اور اپنے غلام کو بھی ایسی ہی چادر اوڑھائی تھی، لوگوں نے دیکھا تو کہا کہ آپ غلام کو دوسرا کپڑا پہنا کر اس سے چادر لے لیجیے، تو آپ کا جوڑا پورا ہو جائے، بولے میں نے ایک بار اپنے غلام کو برا بھلا کہا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ ابوذر ابھی تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے؟ فیک جاہلیۃ، یہ لوگ تمھارے بھائی ہیں،[1]

ایک بار حضرت علیؓ نے دو قمیصیں خریدیں، ان کا غلام بھی ساتھ تھا، اس سے فرمایا ان میں

[1] بخاری کتاب الایمان باب امر الجاہلیہ

جو تمھیں پسند ہو لے لو، اس نے ایک قمیص لے لی،

حضرت عثمانؓ رات کو اٹھ کر خود وضو کرتے تھے، لوگوں نے کہا کہ آپ کسی خادم سے کہہ دیتے تو آپ کو وضو کرا دیا کرتا، بولے نہیں، رات ان کے آرام کے لیے ہے۔[1]

ایک بار ایک صحابی کے بیٹے نے غلام کو طمانچہ مارا، باپ نے دونوں کو بلایا، اور غلام سے کہا کہ اس کا بدلہ لو۔[2]

ایک بار حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگوں کو سبق دینے کے لیے بہت سے غریبوں اور اجیروں کو بلایا اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا، اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہو جو ان کے ساتھ کھانے میں عار محسوس کرتے ہیں،

کیا کوئی مذہب یا موجودہ دور کا کوئی مادی نظام اجیروں کے ساتھ مساوات کا یہ نمونہ پیش کر سکتا ہے،

غالباً اسلامی تعلیم کی خوبی کو دیکھ کر مسٹر رچرڈسن نے قانون ازالۂ غلامی کو انڈیا کونسل میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> غلامی کی مکروہ رسم کو مٹانے کے لیے ضروری ہے کہ ہندو شاستر کو قرآن سے بدل دیا جائے،[3]

اس وقت اشتراکیت کی مساوات کا دنیا میں بڑا چرچا ہے، اور سیدھے سادے مسلمان ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے لکھے پڑھے بھی اس سے متاثر ہوگئے ہیں، مگر اس کی مساوات کا حال یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء کے آخر میں صدر جمہوریہ روس نے قازان کا دورہ کیا تھا، اس دورہ سے

[1] اسد الغابہ تذکرۂ حضرت علیؓ [2] ابو داؤد کتاب الادب

[3] اسلام کے معاشی نظریے

واپس ہوکر انھوں نے کسان قائدین کے مجمع میں اس دورے کے تاثرات بیان کیے، اس میں کہا کہ میں قازان کے ایک مقام پر کسانوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا کہ یکایک ایک عورت سامنے آئی اور چلا کر کہنے لگی تمھارے جوتے تو اتنے اچھے ہیں، مجھے جوتے کب ملیں گے، میں نے اس کو جواب دیا کہ کیا تم چاہتی ہو کہ صدر جمہوریہ چپلوں میں ٹاپتا پھرے، آس پاس کے لوگوں نے بھی میری تائید کی کہ یہ عورت احمق ہے، پھر میں نے ان سے کہا کہ تم چپلیں پہنو تو کوئی محسوس نہیں کرے گا، لیکن میں پہنوں تو ہر شخص کی نظر پڑے گی۔[1]

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام نے ہر قسم کی محنت کی ہمت افزائی کی ہے، اور اس نے محنت کو ذلیل یا گری پڑی چیز قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اس نے اپنے پسینہ کی کمائی کو سب سے بہتر روزی قرار دیا ہے، وہ دوسرے مذاہب اور موجودہ مادی نظامہائے حیات کی طرح محنت کش طبقہ کو معاشرہ میں کوئی الگ عنصر اور ایک خاص طبقہ قرار نہیں دیتا، بلکہ اخلاقی اور قانونی دونوں حیثیتوں سے اس کو وہی مقام دیتا ہے جو دوسرے طبقوں کو حاصل ہے، وہ پیشے کے اختلاف یا مزدور و سرمایہ دار کی حیثیت سے کسی امتیاز کو روا نہیں رکھتا، اس کے یہاں امتیاز کا معیار صرف خدا کا خوف اور احساس ذمہ داری ہے،

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں طبقہ واری کشمکش کی کوئی مثال نہیں ملتی، اوپر کے بیانات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہاں بندہ و آقا میں کوئی فرق نہیں تھا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ان کو (ھم اخوانکم) بھائی بنایا تھا، اسی طرح اسلامی معاشرہ میں ان کے ساتھ بھائیوں کا سلوک روا رکھا گیا،

---

[1] الہدیٰ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۴۶ء بحوالہ لندن ٹائمز

آج بھی صحیح اسلامی معاشرہ میں آپ اس تفریق کا وجود نہیں پائیں گے، اور اگر اس زمانہ میں کوئی صحیح اسلامی حکومت قائم ہوگی تو اس کا اولین فرض ہوگا کہ وہ اس امتیاز کو مٹائے، اس دور کے مغربی معاشیین نے بھی لکھا ہے جیسا کہ مسٹر ٹاسگ کا قول اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ بغیر اس امتیاز کو مٹائے ہوئے مزدوروں کے مسئلہ کا کوئی حل ممکن نہیں ہے،

(باقی)

اطلاع برائے خریداران معارف

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے خریداران معارف کی خدمت میں عرض ہے کہ معارف سے متعلق ہر طرح کی خط و کتابت اور ارسال زر کے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں، ورنہ تعمیل مشکل ہوگی،

ضروری اعلان

پاکستان کے خریداران معارف کو اطلاع دیجاتی ہے کہ وہ آیندہ معارف کی سالانہ قیمت مکتبۃ الشرق کراچی کو نہ بھیجیں، بلکہ دفتر سے خریداروں کے پاس بل بھیجا جائیگا، اور وہ کسی قریبی بینک میں اس بل کا روپیہ جمع کر کے اس کا ڈرافٹ دار المصنفین شبلی اکیڈیمی کے نام بنوا کر دفتر معارف کو بھیجدیں۔

مینجر

اورنگ آباد کی پن چکی اور اس کی تاریخ

از جناب مبارزالدین رفعت صاحب لکچرار، گورنمنٹ کالج، گلبرگہ

اپنی مخصوص دلکشی اور دلفریبی کے لحاظ سے اورنگ آباد کی پن چکی ہندوستان کے پورے طول وعرض میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، اجنتا اور ایلورا کے مشہور عالم غاروں کو دیکھنے کے لیے جو سیاح دور ونزدیک سے آتے ہیں، انھیں ناگزیر طور پر اورنگ آباد سے گزرنا پڑتا ہے، اورنگ آباد میں دیکھنے کے مقامات میں روضۂ تاج محل کی نقل بی بی کا مقبرہ اور حضرت باباشاہ مسافرؒ کی آرام گاہ پن چکی ردیف وقافیے کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ کوئی اورنگ آباد آئے اور پن چکی کے فردوسی نظارے سے لطف اندوز ہوئے بغیر یہاں سے چلا جائے، ہر سال یہاں آنے والے ان گنت سیاحوں میں کتنے ہی سیاح اس جنتِ ارضی کے بارے میں صحیح معلومات کے آرزومند ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ یہاں کوئی ایسا اللہ کا بندہ نہیں جو انھیں صحیح معلومات سے بہرہ ور کر سکے، اس مقام کے تاریخی حالات کی جو تختیاں یہاں آویزاں ہیں وہ یکسر غلطیوں سے پر ہیں، یہاں کے گائیڈ جو باتیں بیان کرتے ہیں وہ سراسر گمراہ کن ہیں، صاحب بارگاہ پن چکی کا اصلی نام تک یہاں کسی کو معلوم نہیں،

درگاہ شریف پن چکی کے اعزازی لائبریرین کی حیثیت سے مجھے خود پن چکی میں اس مقام پر جہاں آج کل مہتمم پن چکی رہتے ہیں، ڈھائی سال سے زیادہ قیام کی سعادت حاصل رہی،

اس تعلق کے بعد جو کچھ پڑھنے میں آیا اس سے دلی افسوس ہوا کہ ہم اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں سے اتنے غافل ہیں کہ خود اورنگ آباد میں پن چکی کے بارے میں صحیح معلومات دینے والا ایک بھی اللہ کا بندہ نظر نہیں آتا، پن چکی کے بارے میں اپنی تازہ حاصل کردہ معلومات کا ذکر میں نے اس وقت کی مجلس انتظامی پن چکی کے صدر اور کلکٹر ضلع اورنگ آباد جناب سیتھو مادھو راؤ صاحب پگڑی حال معتمد مال تعلیمات حکومت حیدرآباد سے کیا، موصوف صحیح عالمانہ ذوق رکھتے ہیں، اور یہ بات انتظامی محکموں کے اعلیٰ افسروں میں شاذونادر ہی دیکھنے میں آتی ہے، انھوں نے مجھ سے بار بار خواہش کی کہ میں اپنی ان معلومات کو ایک جگہ قلمبند کر دوں۔ یہ مضمون ان ہی کی تشویق کا نتیجہ ہے،

اورنگ آباد کی تاریخ اورنگ آباد ریاست حیدرآباد کا شمال میں سب سے آخری ضلع ہے، حیدرآباد پر پولس ایکشن سے پہلے یہ ریاست کے چار صوبوں میں سے ایک صوبہ اور مرہٹہ واڑی کے اضلاع کا صدر مقام تھا، پولس ایکشن کے بعد جب صوبہ داریاں توڑ دی گئیں، تو اورنگ آباد کی صوبہ داری بھی ختم ہو گئی، اب یہ اپنے نام کے ضلع کا صدر مقام ہے، سنٹرل ریلوے کی جو چھوٹی لائن منماڑ سے حیدرآباد جاتی ہے، اس پر منماڑ سے ستر میل کے فاصلے پر واقع ہے، آبادی چھاؤنی کو ملا کر اسی ہزار کے قریب ہے۔

اورنگ آباد کا پرانا نام کھڑکی ہے۔ موجودہ اورنگ آباد احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہوں کے حبشی وزیر ملک عنبر کا بسایا ہوا ہے، لیکن یہ بستی اس سے بھی پرانے زمانے کی ہے، ہمیں اس پرانے زمانے کی کھڑکی کی پوری تاریخ معلوم نہیں، لیکن اس کی شمالی پہاڑیوں میں بدھ مت اور برہمی مت کے جو غار کھدے ملتے ہیں انھیں دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں کافی آبادی رہی ہوگی، شہر کے اندر قدیم زمانے کا ایک مندر

کھڑکیشور ملتا ہے، اس مندر کی تاریخ بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں لیکن ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ مندر ملک عنبر سے بھی پہلے زمانے کا ہے۔

کھڑکی مراٹھی لفظ ہے، اس کا ترجمہ پتھریلی یا پہاڑیوں والی زمین ہے، اس بستی کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں، غالباً اسی لیے اس بستی کا نام کھڑکی پڑ گیا، یہ شہر کھام ندی کے کنارے بسا ہے، اس ندی کا دوسرا نام گنڈا بھی ہے، یہ ایک پہاڑی ندی ہے، اور رسول پورہ اور موسالہ کے قریب کی پہاڑیوں سے نکلتی ہے، جو ہرسول سے شمال میں کوئی دس میل دور ہیں، ہرسول سے کوئی دو میل دور ایک اور پہاڑی نالہ اس میں آکر ملتا ہے، اورنگ آباد سے آگے (۴۸) میل بہنے کے بعد یہ ندی اورنگ آباد کے جنوب میں جوگیشور کے پاس گوداوری ندی سے جا ملتی ہے، اصل بستی دودنا کی خوبصورت وادی میں بسی ہوئی ہے، یہ وادی کوئی دس میل چوڑی ہے، اس کے شمال میں لاکن واڑہ کی اور جنوب میں ستارا کی پہاڑیاں ہیں، یہ بستی بڑی اونچی نیچی زمین پر بسائی گئی ہے، قدیم شہر کا نقشہ مستطیل ہے، اسکی لمبائی ڈھائی میل، چوڑائی سوا میل ، اور رقبہ چھ میل سے کچھ زیادہ ہے، لیکن موجودہ شہر ان حدود سے نکل کر دور تک پھیل گیا ہے۔

کھڑکی کی ٹھیک ٹھیک تاریخ ہمیں ۱۶۱۰ء سے ملتی ہے، اسی سال والی احمد نگر مرتضیٰ نظام شاہ ثانی کے وزیر ملک عنبر نے اسے اپنی راجدھانی بنا کر اس میں نئی نئی عمارتیں بنانی شروع کیں، ملک عنبر اصل میں ایک حبشی غلام تھا، اور عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا، بعد میں اس نے اسلام قبول کیا اور نظام شاہیوں کی ملازمت میں آنے کے بعد اس نے بڑی ترقی کی، اپنی محنت اور قابلیت سے بتدریج اتنا اونچا ہوا کہ چاند بی بی سلطانہ کے دور حکومت میں اس کا وزیر بنا اور چاند بی بی سلطانہ کے مارے جانے کے بعد خود بادشاہ بن گیا، کھڑکی کو جب

اس نے اپنی راجدھانی بنایا تو اس کے ساتھ جو فوج تھی، وہ بھی یہیں بس گئی، اس فوج کے لوگوں نے اپنے رہنے کے لیے یہاں مکان بنا لیے، اس طرح دس سال کے اندر کھڑکی کا چھوٹا سا گاؤں ایک بڑا آباد شہر بن گیا، کہتے ہیں کہ ملک عنبر کے زمانہ میں اس کی آبادی دو لاکھ کے لگ بھگ تھی، کھڑکی کا شہر بسے کوئی گیارہ سال ہوئے تھے کہ یکایک شاہ جہاں نے اس پر ۱۶۲۱ء میں حملہ کیا، اس کی مغل فوج نے اسے لوٹ کر جلا ڈالا لیکن ملک عنبر کی کوشش سے جلد ہی یہ شہر سنبھل گیا اور پھر سے آباد ہو گیا، ۱۶۲۶ء میں ملک عنبر کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا فتح خاں اس کی جگہ گدی پر بیٹھا، اس نے اپنے نام پر کھڑکی کا نام فتح نگر رکھ دیا، اسی سال مغلوں کے ایک سردار خان جہاں لودھی نے اس شہر پر چڑھائی کی، لیکن نظام شاہی فوج کے سپہ سالار حامد خاں نے رشوت دے کر اسے برہان پور کی طرف ٹال دیا، لیکن جب ۱۶۳۳ء میں نظام شاہی بادشاہوں کے دوسرے تمام علاقوں کے ساتھ دولت آباد بھی مغلوں کے ہاتھ آگیا، تو فتح نگر بھی ان کے قبضہ میں چلا گیا، ۱۶۵۳ء میں شہزادہ اورنگ زیب کو جب دوسری بار دکن کی صوبہ داری ملی تو اس نے فتح نگر کو اپنی راجدھانی بنایا، اور اس شہر کا نام بدل کر اپنے نام پر اورنگ آباد رکھا، لیکن اس عہد کے مورخ اسے صرف "خجستہ بنیاد" لکھتے ہیں جس سے تاریخ نکلتی ہے۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جو انتشار سلطنت میں پیدا ہوا اس میں نواب قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ اول کو ریاست حیدرآباد کی بنیاد رکھنے کا موقع ملا، پہلے تو وہ دکن کے صوبہ دار بنا کر اورنگ آباد بھیجے گئے، اس کے بعد جب انھوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد مضبوط کر لی تو اورنگ آباد سے اپنا پایہ تخت حیدرآباد منتقل کر دیا، اس کے بعد سے اب تک یہ ریاست حیدرآباد کا ایک صوبہ بنا رہا،

ملک عنبر نے اپنے زمانہ میں اس شہر کی کوئی فصیل بنائی تھی یا نہیں، اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا، اب جس فصیل کے کھنڈر شہر کے چاروں طرف دکھائی دیتے ہیں وہ اورنگزیب کے عہد کی فصیل کے ہیں، یہ فصیل مرہٹوں کے اچانک حملوں سے شہر کو بچانے کے لیے خان جہاں نے بادشاہ کے حکم پر بنائی تھی، یہ فصیل بڑی مضبوط تھی، اس میں مورچے دیے گئے تھے، جن پر توپیں نصب تھیں، یہ فصیل چودہ فیٹ اونچی تھی، اس میں چار بڑے پھاٹک اور کئی کھڑکیاں تھیں، چاروں پھاٹک اور کچھ کھڑکیاں اب بھی باقی ہیں، شمال میں دہلی دروازہ، جنوب میں پیٹن دروازہ، مشرق میں جالنہ دروازہ اور مغرب میں مکئی دروازہ،

نہ جانے کب سے اورنگ آباد اور اس کے آس پاس کی سرزمین شعر و نغمہ، آرٹ و مصوری علم و ادب اور حکمت و عرفان کی سرزمین رہی ہے، اسی سرزمین میں اجنتا کی لازوال تصویریں بنیں، اسی سرزمین پر ایلورا کی جادو بھری تعمیر کاری نے جنم لیا، اسی سرزمین پر دیوگڑھ کا پراسرار قلعہ اپنا سینہ تانے کھڑا ہے، اسی سرزمین پر ایک ناتھ اور سنت نرنجن نے بھگتی کے گیت گائے، اسی سرزمین پر خواجہ منتخب الدین، خواجہ برہان الدین غریب، شاہ نور حموی، حضرت نظام الدین اولیا اورنگ آبادی، شاہ علی نہری اور کتنے ہی صوفیاے عظام نے علم و عرفان کی بارش کی، اسی سرزمین پر اردو شاعری کے باباے اول ولی اورنگ آبادی نے اور اس کے بعد سراج اورنگ آبادی نے ایک نئی لے میں محبت کا ترانہ گایا، جس نے اردو شاعری کا راستہ ہی بدل دیا،

شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن کی صوبہ داری اور اس کے بعد شہنشاہ ہونے کے بعد اپنی زندگی کا بڑا حصہ اورنگ آباد ہی میں بسر کیا، اورنگ آباد عرصۂ دراز تک مغلیہ سلطنت کا دار الحکومت بنا رہا، یہی زمانہ اورنگ آباد کے شباب کا زمانہ تھا، ہندوستان کے امرا، علما، مشائخ

جن کا اس سلطنت سے تعلق تھا، اورنگ آباد چلے آئے اور یہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی، ان کے دم قدم سے اورنگ آباد علوم و فنون اور حکمت و عرفان کا مرکز بن گیا، مغلوں کے دور انحطاط میں بھی اورنگ آباد کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آنے پائی، اس کی بڑی وجہ ریاست حیدرآباد دکن کے بانی نواب قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ اول کا ایک عرصۂ دراز تک یہاں قیام تھا، اس دور میں اورنگ آباد کے سرمایۂ ناز مقام پن چکی کی داغ بیل پڑی،

پن چکی کا محل وقوع اورنگ آباد کی اندرونی شہر پناہ کے سب سے شاندار دروازے "بھڑکل" سے نکل کر اس راستے پر جو ریلوے اسٹیشن کو جاتا ہے، آدھ فرلانگ چل کر جوبلی پارک سے متصل ایک سہ راہا ملتا ہے، مغرب کی طرف اس راستہ پر جو چھاؤنی کو جاتا ہے، ایک فرلانگ کے فاصلہ پر کھام ندی کے کنارے پن چکی واقع ہے، اس کے مشرق میں کھام ندی بہتی ہے، جس کے مشرقی کناروں پر اورنگ آباد کی ٹوٹی پھوٹی شہر پناہ اپنی اقبال مندی کے دنوں کی مرثیہ خواں کھڑی ہے، اس سے کچھ پہلے شمال مشرق میں پھیلے ہوئے ملک عنبر اور آصف جاہ اول کے بنائے ہوئے محلوں کے کھنڈر ہیں، جو "نوکھنڈہ" کہلاتے ہیں، اسی شہر پناہ سے لگی ہوئی جمیل بیگ خاں کی بنائی ہوئی خوبصورت مسجد ہے، اس کے بعد شاندار محمود دروازہ ہے، اور دروازے کے بعد کھام ندی پر بنا ہوا چھوٹا سا سنگین پل ہے، مسجد جمیل بیگ کے مقابل دوسرے کنارے پر وسیع قبرستان ہے، اور اس سے آگے قطب پورہ اور بیگم پورہ کے محلے ہیں، جنوب مغرب میں ابھی کچھ سال ہوئے اس درگاہ سے متعلق وسیع زمین پر جو اب فروخت کر دی گئی ہے، پیپلس ایجوکیشنل سوسائٹی کالج کی شاندار عمارتیں بنائی گئی ہیں، یہ کالج بھارت کے مشہور ماہر قانون اور ہریجن لیڈر ڈاکٹر امبیدکر کی کوششوں سے قائم ہوا ہے، اور اس کی مرکزی عمارت کا بنیادی پتھر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے

ہاتھوں رکھا گیا ہے، کالج کی عمارتوں کے بعد ہی اورنگ آباد کی چھاؤنی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے،
قدیم و جدید کے اس دلکش امتزاج کے درمیان پن چکی کا خوبصورت باغ اور اس کی دلکش عمارتیں
واقع ہیں، یہاں کا نواحی نظارہ اورنگ آباد کے دلکش ترین مناظر میں سے ہے،

پن چکی کا یہ فردوسی مقام اور یہ جنت ارضی اصل میں حضرت باباشاہ سعید پلنگ پوشؒ
اور ان کے مرید اور خلیفہ حضرت باباشاہ محمد عاشور مسافر شاہؒ کی آخری آرام گاہ اور ان کے
سلسلہ کے مریدوں کا تکیہ ہے، اس لیے ان مبارک اور مقدس بزرگوں کے حالاتِ زندگی سے
اس مقام کے بیان کا آغاز کیا جاتا ہے،

حضرت بابا محمد سعید پلنگ پوش نقشبندیؒ

باباشاہ پلنگ پوش کا اصل نام محمد سعید ہے، وسط ایشیا کے مشہور شہر بخارا
کے قریب ایک مردم خیز قصبہ غجدوان میں دسویں صدی ہجری کے نصف
آخر کے ابتدائی سالوں میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی، اسی غجدوان کی خاک سے آپ
کے پیر خواجہ درویش عزیزاں اٹھے، اسی خاک نے خواجۂ نقشبند کے اوپر کے سلسلہ کے چھٹے پیر
خواجہ عبدالخالق غجدوانی کو جنم دیا، یہی قصبہ کبھی شہنشاہ بابر کی آبائی سلطنت فرغانہ میں داخل
رہا، اور اسی مقام پر وہ ۱۴۹۴ء میں اپنے باپ کے جانشین کی حیثیت سے سریر آرائے سلطنت
ہوا، اور اسی غجدوان کے قریب ۱۵۱۲ء میں اپنے آبائی دشمن شیبانی خاں اور اس کے بیٹوں
کے مقابلے میں آخری لڑائی میں اسے شکست اٹھانی پڑی اور ہمیشہ کے لیے اپنی آبائی سلطنت سے
اسے ہاتھ دھونا پڑا، یہاں سے مایوس ہو کر نکلا تو ابوالفضل کے الفاظ میں "الہام غیبی" سے ماوراءالنہر
کا ارادہ ترک اور ممالکِ ہند کی تسخیر کا قصد کر کے ہندوستان پہنچا، تو اس ملک کی شہنشاہیت
نے اس کے قدم چومے۔ اسی غجدوان کی سرزمین سے حضرت بابا محمد سعید پلنگ پوش اور انکے
مرید باصفا حضرت محمد عاشور باباشاہ مسافر تھے، اور جب یہاں سے ارضِ ہند کا رخ کیا تو ولایت الٰہی

کا تاج ان کے مبارک سروں پر رکھا گیا، کیسی مبارک تھی موجودہ روسی ترکستان کے علاقہ میں شامل
غجدوان کی یہ سرزمین کہ اس کے سپوتوں میں ایک کو مادی شہنشاہیت بخشی گئی تو دوسروں کے
سروں پر اس ملک کی روحانی بادشاہت کا تاج رکھا گیا،

حضرت بابا سعید پلنگ پوشؒ اپنے عہد کے ایک صاحب ثروت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے،
آپ کے والد دنیوی مال و دولت سے سرفراز تھے، لڑکپن ہی میں مروجہ نصاب کی تکمیل فرمائی،
اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت کی بدولت اپنے ساتھیوں میں سب سے آگے رہتے تھے، ایک دن
اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ میں مصروف تھے کہ دیکھا راستے سے قلندروں کا ایک گروہ
گزر رہا ہے، اس گروہ کے درمیان ایک شخص کے چہرے پر نور ہی نور برس رہا تھا، اس کو
دیکھتے ہی اس پر سو جان سے فدا ہو گئے، یہ بابا قل احمد کی ذات مبارک تھی، آپ کو عام طور
پر لوگ بابا قل فرید یا بابا قل مزید کہا کرتے تھے، آپ اپنے زمانے کے قطب تھے، ملامتی فرقہ سے
تعلق رکھتے تھے، زبان پر بے معنی اور بے تکی باتیں ہوتی تھیں، ظاہر میں تو دیوانگی کی سی کیفیت
طاری لیکن باطن میں دریائے معرفت کی غواصی جاری تھی، بابا قل احمد کی کشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ
حضرت محمد سعید درویشوں کے اس گروہ کے پیچھے پیچھے ہو لئے، اور سایہ کی طرح بابا قل مزید
یا قل فرید کے ساتھ رہنے لگے، حضرت محمد سعید نے ان سے بیعت کی التجا کی، قبول نہ ہوئی، فرمایا
"درویشی کار دشوار است" ابھی تمہاری عمر سات سال کی ہے، ابھی تحصیل علم میں لگے رہو، حضرت
سعید جو کسی اور عالم کی جھلک دیکھ چکے تھے، اس عالم سے واپس ہونا گوارا نہ ہوا، ایک مدت تک
درویشوں کے گروہ ہی میں گزری، ایک رات بابا قل فرید کا قیام بخارا کے کسی مدرسے کے ایک
حجرے میں تھا، دروازہ اندر سے بند تھا، حضرت محمد سعید اس حجرے کے دروازے سے لگ کر کھڑے
ہو گئے، بڑی رات گئے اندر سے آواز آئی کون ہے؟ جواب دیا، حضرت کا فقیر، بابا قل احمد عرف

بابا قل فرید نے شفقت و مرحمت سے دروازہ کھول دیا، اور انھیں اندر بلا لیا، اس کے بعد ملامتیوں کی طرح کچھ مستانہ باتیں کیں، حضرت محمد سعید پر ان باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا، الٹے بابا صاحب سے ارادت مندی میں اضافہ ہو گیا اسوقت بابا صاحب نے آپ کی طرف توجہ فرمائی اور درویشی کی خلعت سے سرفراز فرمایا،

سات آٹھ سال کی عمر میں یہ لگن دیکھکر مرشد کامل نے خلعت درویشانہ سے سرفراز فرمایا، خرقۂ درویشی کا پہننا تھا کہ آپ پر جذب کی ایسی کیفیت ہوئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کپڑے پھاڑ برہنہ جنگل کی طرف نکل گئے، اسی برہنگی کے عالم میں قریب گیارہ سال صحرا نوردی کرتے رہے، بخارا کے محلہ قرشی میں ہفتہ میں دو بار بازار لگتا تھا، کبھی کبھار آپ بھی بازار میں آجاتے، لوگ کپڑے پیش کرتے، قبول نہ فرماتے۔ لوگوں میں "دیوانے سعید" کے نام سے مشہور ہو گئے، گیارہ سال بعد جذب کی کیفیت قرشی کے اسی بازار میں آپ سے کم ہو گئی، بازار بھرا ہوا تھا، آپ نے کسی شخص سے لباس لیکر پہنا، لوگ خوش ہو گئے کہ "دیوانے سعید" کو ہوش آگیا، اس کے بعد آپنے اپنے لباس کے لیے مستقل طور پر چیتے کا چمڑا انتخاب فرمایا، یہی چمڑا آپ کے جسم مبارک سے لپٹا رہتا تھا، اور اسی چیتے کے چمڑے کی وجہ سے آپ کا لقب "بابا پلنگ پوش" یعنی "چیتے کا چمڑا پہنے والا بابا" ہو گیا۔

حالت جذب سے واپسی کے بعد آپ بخارا سے نکلے، اور اپنے پیر حضرت قل احمد کی خدمت میں پہنچ گئے، بابا قل احمد ہی کے ساتھ آپ نے حرمین شریفین کی زیارت فرمائی، اور آپ ہی کے ساتھ بخارا واپس آئے، حضرت بابا قل احمد نے اپنی وفات کا وقت قریب آتا دیکھ کر حضرت بابا سعید پلنگ پوش کو مزید تربیت باطنی کے لیے اپنے ایک پیر بھائی شیخ درویش عزیزان کے حوالے کیا اور فرمایا یہ میرا بیٹا ہے اس کی تربیت اب تمہارے سپرد ہے، اسکے کچھ ہی دنوں بعد بابا صاحب نے انتقال فرمایا۔

بابا قل احمد کے انتقال کے بعد بابا سعید پلنگ پوش مدتوں اپنے شیخ حضرت درویش عزیزاں

کی خدمت میں کمربستہ رہے۔ اور ان کے فیض روحانی سے درجۂ کمال پر فائز رہے، بابا قل احمد اور شیخ درویش عزیزاں دونوں سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ میں منسلک تھے اور صاحبان خرقہ تھے، سلسلہ نقشبندیہ کے بانی حضرت محمد بن محمد الملقب بہاء الدین نقشبند متوفی ۳ ربیع الاول سنہ ۷۹۱ھ آٹھویں صدی ہجری میں ہوئے ہیں، آپ کا مزار پرانوار قبۃ الاسلام بخارا میں ہے جو صدیوں تک اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہے، اسی لیے آپ کا سلسلہ وسط ایشیا میں بہت پھیلا ہے، آپ کے مزار مبارک ہی کی وجہ سے بخارا کی تعریف میں مولانا عبد الرحمٰن جامی فرما گئے ہیں،

سکہ کہ در یثرب و بطحا زدند — نوبت آخر بہ بخارا زدند
از خط آں سکہ نشد بہرہ مند — جز دل بے نقش کہ شد نقشبند
آں گہر پاک نہ ہر جا بود — معدن او خاک بخارا بود

حضرت بابا پلنگ پوش کا سلسلۂ بیعت سات واسطوں سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند تک پہنچتا ہے، اور ایک نسبت سے ۲۳ واسطوں کے بعد حضرت علیؓ سے ہوتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، اور دوسری نسبت سے (۲۴) واسطوں کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ہوتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باطنی تعلیم کی تکمیل کے بعد غالباً اپنے مرشد کے حکم سے حضرت بابا پلنگ پوش نے ہندوستان کا رخ کیا، ہندوستان میں آپ کی آمد کی تاریخ معلوم نہیں، قیاساً گیارہویں صدی ہجری کے ربع آخر میں ورود ہوا ہوگا، مختلف مقاموں کی سیر کرتے ہوئے آپ کابل پہنچے، بہت دنوں تک یہاں مقیم رہے، پھر کشمیر جنت نظیر میں کئی سال اقامت اختیار کی، فارسی کے مشہور کشمیری شاعر غنی کشمیری کو آپ سے بڑی ارادت پیدا ہو گئی تھی، حسن ابدال کشمیر میں ایک عرصہ تک قیام کے بعد آپ نے دوبارہ حرمین شریفین کی زیارت کا ارادہ کیا، ان کی زیارت سے

فارغ ہو کر پھر حسن ابدال آئے، کچھ دن قیام فرمانے کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور دہلی سے اورنگ آباد پہنچے، ان دنوں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کی مسند سلطنت پر متمکن اور شاہ زادہ محمد معظم بہادر شاہ اورنگ آباد کا ناظم یا گورنر تھا، اورنگ آباد آکر بابا پلنگ پوش نے قطب پورہ کے نالہ کے قریب درویش شاہ عنایت کے تکیہ میں قیام کیا،

اس کے بعد حضرت بابا محمد سعید پلنگ پوش کا مستقل تعلق ریاست حیدرآباد دکن کے بانی حضرت آصف جاہ اول کے والد نواب میر شہاب الدین خاں مخاطب بہ غازی الدین بہادر فیروز جنگ کے لشکر سے ہو گیا اورنگ آباد سے آپ سیدھے اس لشکر میں چلے گئے، جو اس وقت دکن کی کسی مہم میں مصروف تھا، آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ غیب سے انھیں اس لشکر کی حفاظت کا حکم ملا ہے، اسکے بعد نواب فیروز جنگ کا لشکر جہاں جاتا آپ بھی اس کے ہمراہ جاتے، اس طرح ہندوستان میں آپ کا قیام مختلف مقامات پر رہا، کبھی دہلی میں رہے، کبھی اورنگ آباد میں، کبھی برہان پور میں اور کبھی نوساری میں، آپ کی زندگی کے آخری دن گلبرگہ میں گذرے،

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کو بھی آپ کی ذات مبارک سے بڑی گہری عقیدت تھی، وہ آپ کا بڑا ادب کرتے تھے، آپکے حضور میں حاضر ہوتے تو دور ہی سے پالکی سے اتر پڑتے اور مشکل مہموں پر جاتے ہوئے بڑے ادب کے ساتھ اپنے لیے دعائے خیر کی استدعا کرتے،

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کے صاحبزادے نواب میر قمر الدین خاں تھے، نواب میر قمر الدین خاں نے آگے چل کر محمد شاہ سے نظام الملک آصف جاہ کا خطاب پایا، یہی سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن کے بانی تھے، جب ان کی عمر سات سال کی ہوئی تو ان کے والد نواب فیروز جنگ نے ایک جشن کیا، اس جشن میں نواب قمر الدین خاں نے آفتابہ لے کر حضرت بابا محمد سعید پلنگ پوش اور دوچار اور بزرگوں کے ہاتھ دھلائے، کھانے کے بعد نواب غازی الدین خاں نے

حضرت بابا پلنگ پوش سے درخواست کی کہ حلقۂ ذکر ہو اور اس کے بعد بچے کے لیے دعا کی جائے، حلقہ شروع ہوا، بیچ حلقہ میں ایک بڑا چراغ جو گویا بچے کی خوش نصیبی کی علامت تھی، رکھا گیا اور اس چراغ کے قریب بچے کو بٹھایا گیا، ذکر کی تیز سانسوں میں چراغ یکایک بجھ گیا، نواب غازی الدین خاں نے چراغ کے بجھ جانے کو برا شگون جانا، حضرت بابا پلنگ پوش کی عادت تھی کہ وہ حلقہ کے اطراف "ہو، ہو" فرماتے ہوئے گھومتے جاتے تھے، جب چراغ بجھا آپ اس سے کافی دور تھے، چراغ بجھتے ہی آپ نے وہیں سے "ہو" کا نعرہ لگایا اور چراغ پر پھونکا، بجھا ہوا چراغ فوراً ہی جل اٹھا، نواب غازی الدین خاں نے یہ دیکھ کر اپنا سر آپ کے قدموں پر رکھ دیا، اور بچے کو بھی آپکے قدموں پر ڈال دیا،

حضرت بابا پلنگ پوش کے کشف و کرامات کے اور بھی کئی واقعات ملفوظات نقشبندیہ اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکرام میں درج ہیں،

بابا صاحب کے ساتھ ہمیشہ قلندروں، مریدوں اور ارادت مندوں کا ایک انبوہ رہا کرتا تھا، جہاں کہیں قیام فرماتے لوگوں کا تانتا لگ جاتا، آپ ان کو قہوہ پلاتے، حلوہ کھلاتے اور دعوتیں دیا کرتے تھے، آپ کی محفلیں بھی عجیب ہوتی تھیں، ایک طرف شاعر ہوتے، ایک طرف ادیب ہوتے، ایک طرف علماء، آپ کی سواری اس شان سے نکلتی کہ سواری کے ساتھ خوش رنگ پھولوں سے لدے ستر اسی گملے آدمی اپنے سروں پر لیے ہوئے ساتھ ہوتے، جہاں کہیں فروکش ہوتے ان ہی گملوں سے ایک گلستاں ترتیب دے لیا جاتا، ولایتی فقیروں میں ڈیڑھ دو فقیر ترکش بند جلو میں چلتے، دوسرے فقیر سر و پا برہنہ بدن پر صرف ایک لنگ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ساتھ رہتے، شاہ نعمت نامی فقیر آپ کی سواری کے آگے مور کے پروں کا بنا ہوا ایک وزنی آفتاب گیر لیے چلتے،

بابا پلنگ پوش کا طریقہ قلندرانہ تھا، تمام لوگوں سے چاہے وہ آشنا ہوں کہ بیگانہ، شاہ ہوں کہ گدا، مرحمت اور مکرمت سے پیش آتے تھے، بچوں اور بے نواؤں پر خاص شفقت فرماتے تھے، آپ پر ایک طرح کی وجدانی کیفیت طاری رہتی تھی، کبھی کبھی شان جلالی کا بھی اظہار ہوتا تھا، لیکن عام رنگ شفقت اور محبت ہی کا تھا،

حضرت بابا سعید پلنگ پوش کی زندگی حد درجہ درویشانہ تھی، جو کچھ امرا اور صاحبان ثروت نذر کرتے، آپ اس کو درویشوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتے بعض وقت اصرار کرکے نذر لیتے، فرماتے تھے، ہمارا کام ہی امیروں سے لینا اور فقیروں میں بانٹنا ہے، آپ نے عمر بھر تجرد کی زندگی بسر فرمائی اور خانہ داری کے بکھیڑوں سے آزاد رہے۔

حضرت محمد سعید بابا پلنگ پوش نے، رمضان المبارک سنہ ۱۱۱۱ھ میں نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کے لشکر ہی میں وفات پائی، اس وقت نواب غازی الدین کا یہ لشکر گلبرگہ کے نواح میں پڑاؤ ڈالے پڑا تھا، انتقال کے بعد آپ کے مرید اور جانشین حضرت بابا شاہ مسافر کے اہتمام میں آپ کا جسد مبارک اورنگ آباد لایا گیا، اور پن چکی کے احاطہ میں دفن کیا گیا، حضرت بابا شاہ مسافر کے گنبد میں مسجد کی دیوار سے متصل دوسرا مزار آپ ہی کا ہے۔

حضرت بابا پلنگ پوشؒ کے انتقال پر کسی ہم عصر شاعر نے حسب ذیل فارسی قطعۂ تاریخ کہا، یہی قطعۂ تاریخ پائیں مزار کی دیوار پر باہر کی طرف پتھر میں کندہ کر دیا گیا ہے ؎

قطب، دے زہی و غوث زماں   اختر برج سعد شاہ سعید
سال تاریخ وصل گفت خرد   قصر جنت بود مکان سعید
۱۱۱۰ھ

حضرت محمد عاشور بابا شاہ مسافر

آپ کا اصل نام محمد عاشور ہے، شاہ مسافر کا خطاب آپ کے پیر حضرت بابا شاہ پلنگ پوش نے عطا کیا تھا، آپ کے والد کبرویہ سلسلہ کے پیر تھے،

اور والدہ ماجدہ خاندان سادات سے تھیں، آپ غجدوان میں پیدا ہوئے، ولادت کی تاریخ معلوم نہیں، قیاس چاہتا ہے کہ سنہ ۱۰۶۰ھ کے بعد کے کسی سال میں ہوئی ہوگی، ابھی بہت کم سن تھے کہ والد اور والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، خالہ نے آپ کی پرورش اپنے ذمہ لی، حصول علم کے لیے سات سال کی عمر میں غجدوان سے بخارا تشریف لائے اور مسجد شیخ پیر محمد کے مکتب میں شریک ہو گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں آپ نے کلام مجید حفظ کیا اور علوم متداولہ کی تکمیل کی، آپ کے والد کبرویہ سلسلہ کے شیخ تھے، اس لیے ابتدا میں آپ نے بھی اس سلسلہ کے ایک شیخ میر عطاء اللہ ساکتری کے ہاتھ پر بیعت کرکے طریقہ کبرویہ کی ریاضت میں لگ گئے،

دوران تعلیم میں ایک دن حضرت محمد عاشور نے مکتب کی مسجد کے صحن میں توت کے درخت کے نیچے بابا سعید پلنگ پوش کو بیٹھے دیکھا، بے اختیار طبیعت ان کی طرف کھنچ گئی، اور پڑھنے لکھنے سے جی اچاٹ ہو گیا، اس وقت تو طبیعت پر جبر کرکے علم ظاہر کی تکمیل میں لگے رہے، لیکن دوسری بار پھر یہی ہوا، تیسری مرتبہ صبر کا پیمانہ ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور آپ علوم ظاہری سے دست کش ہو کر حضرت بابا پلنگ پوش کے پیچھے پیچھے چل پڑے، اور اکثر ان کی خدمت میں بار یاب رہنے لگے، ان ہی دنوں بابا سعید پلنگ پوش نے نجف اشرف کی زیارت کا ارادہ کیا، آپ کو اس کی خبر ملی تو آپ بھی ان کے پیچھے چل پڑے، بلخ ہوتے ہوئے نجف اشرف پہنچے، تو معلوم ہوا کہ حضرت بابا شاہ پلنگ پوش زیارت سے فارغ ہو کر غزنہ ہوتے ہوئے کابل چلے گئے ہیں، غزنہ میں آپ عرصہ تک قیام کرنے کے بعد کابل پہنچے، یہاں معلوم ہوا کہ حضرت پشاور چلے گئے ہیں، اس لیے آپ نے بھی پشاور کا رخ کیا، پشاور میں معلوم ہوا کہ آپ حسن ابدال کشمیر میں تشریف فرما ہیں، چنانچہ حسن ابدال میں آپ بابا شاہ پلنگ پوش کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، یہیں آپ کو بیعت کا شرف حاصل ہوا، خرقہ و کلاہ سے سرفراز اور شاہ مسافر کے خطاب سے مفتخر

کیے گئے، راہِ طریقت کے اس مسافر کا یہ خطاب اتنا مقبول خاص و عام ہوا کہ لوگ آپ کا اصل نام ہی بھول گئے، اور باباشاہ مسافر کے لقب ہی سے شہرت پائی،

حسن ابدال میں قیام کے دوران میں باباشاہ پلنگ پوش کے بعض مریدوں نے بنگالہ کی سیر کا ارادہ کیا، باباشاہ مسافر بھی اپنے پیر کی اجازت سے ان مریدوں میں شامل ہو گئے، ادھر آپ بنگالہ گئے، اُدھر آپ کے پیر نے دوسری بار زیارت حرمین شریفین کے لیے رخت سفر باندھا، انکی زیارت سے فارغ ہو کر باباشاہ پلنگ پوش حسن ابدال آئے، یہاں سے دہلی اور دہلی سے اورنگ آباد تشریف لائے، اورنگ آباد میں آپ نے شاہ عنایت کے تکیہ میں قیام کیا، باباشاہ مسافر کو اپنی سیاحت کے دوران میں جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے پیر اورنگ آباد میں تشریف رکھتے ہیں، تو آپ بھی ٹھٹھہ، بھکر، بنگالہ، جگناتھ پوری، اڑیسہ اور کوکن کی سیر کرتے ہوئے چنجی اور چنجاور کے راستے حیدرآباد ہوتے ہوئے اورنگ آباد پہنچ گئے، حضرت باباشاہ پلنگ پوش کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا، اور اپنے سر سے کلاہ اتار کر آپ کے سر پر رکھ دی اور اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا، اس کے بعد اپنے مریدوں اور معتقدوں سے ارشاد فرمایا کہ آیندہ سے باباشاہ مسافر کو ہم سے بڑھ کر جانیں،

باباشاہ پلنگ پوش نے کچھ دنوں تک اورنگ آباد میں قیام فرمانے کے بعد پھر کشمیر کا رخ کیا، اور حسن ابدال میں مقیم ہو گئے، یہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد اپنے پیر کی اجازت سے حرمین شریفین کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے، ٹھٹھہ اور بھکر ہوتے ہوئے سورت پہنچے، یہاں سے ایک قافلہ کے ساتھ پیدل سفر پر روانہ ہو گئے، قافلہ کو راستہ بھر پانی پلاتے گئے، اور انتہائی فقر و فاقہ میں بسر کی، حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کے بعد پیر کی کشش آپ کو پھر ہندوستان لے آئی، آپ کی بادِ سمندر کے راستے سورت آئے اور سورت سے اورنگ آباد پہنچ گئے،

اس دوران میں حضرت باباشاہ پلنگ پوش کا تعلق نواب غازی الدین خاں کے لشکر سے ہو گیا تھا، اور آپ لشکر کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف مقاموں پر پھر رہے تھے، اور بگرآباد پہنچ کر باباشاہ مسافر نے شاہ عنایت کے تکیہ میں قیام فرمایا، اس وقت آپ شدید بخار میں مبتلا تھے، یہ دیکھ کر شاہ عنایت نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ آپ مغل ہیں اور لوگوں میں مشہور ہے کہ مغل فقیروں کے پاس کافی اشرفیاں ہوتی ہیں، اگر کوئی بات ہو جائے تو حاکم شہر مجھے ستائے گا، شاہ عنایت کا یہ وہم سن کر آپ اسی شدتِ بخار کی حالت میں تکیہ سے نکل کر کھام ندی کے کنارے چلے گئے، پھر وہاں سے آہستہ آہستہ اسی ندی کے کنارے ایک خس پوش مسجد میں آکر ٹھہر گئے۔

یہاں شاہ شیریں نامی ایک مجذوب درویش رہتے تھے، جو عالم بھی تھے اور محدث بھی، شہر میں ان کے معتقد کافی تھے، حضرت باباشاہ مسافر یہاں پہنچے تو شاہ شیریں آپ کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، اور کہا "خوب آئے" یہ تمھاری جگہ ہے ایک مدت میں نے اس کی پاسبانی کی، اب اپنی جگہ سنبھالو، یہ کہا اور سلام کر کے رخصت ہو گئے، اور سلطان گنج میں سکونت اختیار کر لی اور ان کے بجائے باباشاہ مسافر نے یہاں قیام کیا، یہی مقام آگے چل کر پن چکی کہلایا،

یہاں مستقل قیام کے بعد آہستہ آہستہ آپ کے زہد و تقوی اور عبادت گزاری کی شہرت پھیلنے لگی، ارادت مندوں کی آمد و رفت بھی بڑھنے لگی، مومن بیگ نامی ایک معتقد نے آپ کی اجازت سے خس پوش مسجد کی جگہ کھپریل پوش مسجد تعمیر کر دی، ایک اور معتقد جمیل بیگ کے داماد خواجہ محمد ذاکر نے فقراء کے لیے مسجد سے متصل بنگلہ بنانے کی سعادت حاصل کی، کسی وقت حضرت کے پاس نذر کے دو سو روپیے آگئے، تو مسجد کے اطراف احاطہ بھی بن گیا، مرزا عرب بیگ نامی ایک اور معتقد نے مسجد کی کچی دیواروں کو گرا کر پکی دیواروں اور پختہ کے ساتھ مسجد کو دوبارہ تعمیر کرا دیا، میر محمد طاہر ہراتی ایک اور مرید نے فقراء کے لیے ایک بڑا کنواں کھدوا دیا، ایک مرید نے اس کے

موٹ لگوا دی اور مسجد کے سامنے ایک حوض تیار کرا دیا، اسی مرید نے "تالاب" سے تکیہ تک نہر بھی تیار کرائی جو بعد میں بابا شاہ محمود کی تعمیر کردہ نہر کے بعد استعمال میں نہ رہی، غرض بتدریج معتقدوں اور مریدوں کی کثرت ہوتی گئی، فقیروں اور درویشوں کو ہدایت کا بڑا سرچشمہ ہاتھ آگیا، بابا شاہ مسافر نے نہ صرف ان لوگوں کی دینی رہنمائی فرمائی بلکہ آپ کی ذات مبارک کی وجہ سے اس علاقہ کے لوگوں میں عام دینداری بھی پھیل گئی،

حضرت بابا شاہ مسافر کی زندگی نہایت سادہ اور درویشانہ تھی، اکثر بدن کے ایک جوڑے، پانی کے ایک لوٹے اور ایک بوریے کے سوا اسباب دنیا میں آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہوتا، آپ اپنے لیے کوئی چیز قبول نہ فرماتے، غیب سے جو کچھ فتوحات پہنچتیں انھیں مستحقوں اور غریبوں میں بانٹ دیا کرتے تھے، اگر کوئی اصرار کرکے اچھے کپڑے پہنا دیتا تو اس کی خاطر ایک آدھ روز پہن کر وہ کپڑے کسی مسکین کو عطا فرما دیتے، کتنے ہی غریب غربا اور یتیم و محتاج آپ کے فیض عام سے مستفید ہوتے تھے، خانقاہ میں غریب بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام فرمایا تھا، آپ کے ایک مرید آخوند ملا خاموش یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے، آپ نے کبھی کسی رئیس یا دولت مند کے آستانہ پر حاضری نہیں دی، بارش کے دنوں میں آپ بیواؤں کو چھپر خرید خرید کر دیتے اور آپ کے مرید انھیں اٹھا کر بیواؤں کے گھر پہنچاتے، اس کے ساتھ ہی مریدوں کو ان کے گھروں کی ضروری مرمت کا بھی حکم تھا، کوئی غریب دعوت دیتا تو اس کے گھر ضرور جاتے، غریب ملنے جلنے والا بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے جاتے، مرجاتا تو اس کی نماز جنازہ میں شرکت فرماتے لیکن امرا کی دعوت قبول نہ فرماتے،

فقر کے بارے میں آپ کا ارشاد تھا، فقر کے تین حرف ہیں، ف، ق اور ر، ف سے اشارہ ہے فاقہ کی طرف، ق سے اشارہ ہے قناعت کی طرف اور ر اشارہ ہے ریاضت

کی طرف، جس کسی نے ان تینوں کو اپنایا، وہی فقیر کہلانے کا مستحق ہے،

حضرت بابا شاہ مسافر اور آپ کے پیر حضرت بابا پلنگ پوش کی طبائع میں کچھ ایسا ہی فرق ہے، جیسا حضرت نظام الدین اولیا دہلوی اور ان کے خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی میں تھا، حضرت بابا پلنگ پوش پر جذب و کیف اور مستی کی کیفیت طاری تھی اور حضرت بابا مسافر پر سوختگی اور خشیت الٰہی کا رنگ غالب تھا،

حضرت بابا شاہ مسافر کبھی کسی سے کچھ طلب نہ فرماتے تھے، کہیں سے آپ کی کوئی بندھی ہوئی آمدنی نہ تھی، جس دن جو کچھ آجاتا سب کا سب اسی دن بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا کرتے،

حضرت کے اوقات و معمولات یہ تھے کہ اکثر راتیں شب بیداری میں کٹتیں، آدھی رات کے بعد اپنے حجرہ سے برآمد ہو کر ایک بار کبھی دو بار پورے تکیہ کا چکر لگاتے، اور یہاں رہنے والے فقیروں اور مریدوں کے سرہانے تھوڑی دیر کھڑے رہتے، ایک پہر رات رہے مسجد میں تشریف لاتے اور قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتے، اس وقت سے ارادت مند حاضر ہوتے جاتے، اور آپ کا فیضان جاری ہو جاتا، صبح صادق کے وقت، موذن کو اذان کے لیے فرماتے، باجماعت نماز ادا کرکے حجرہ میں تشریف لے جاتے، اور ادھر مسجد میں آپ کے خاص خاص مرید اشراق تک مراقبہ میں مشغول رہتے، نماز اشراق کے بعد بنگلہ پر تشریف فرما ہوتے اور مثنوی معنوی کا درس شروع ہوتا، شیخ عبد اللہ نامی ایک خوش الحان شاعر جو بخارا کے رہنے والے تھے مثنوی پڑھتے، حاضرین سنتے، کوئی مشکل مقام آتا تو آپس میں مذاکرہ اور مباحثہ کرتے، اس پر بھی مطلب واضح نہ ہوتا تو حضرت اس کی تفسیر کرتے اور سب کی تشفی ہو جاتی، ایک پہر دن تک مثنوی کا درس جاری رہتا، اس کے بعد آپ حجرہ میں تشریف لے جاتے اور لوگ اپنے اپنے

گھروں کو چلے جاتے۔ حجرہ میں آکر حضرت پھر تجدید وضو فرماتے اور تفسیر اور حدیث کے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے، دوپہر میں ایک گھنٹہ قیلولہ فرماتے، پھر وضو کر کے جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کرتے۔ ظہر کی نماز کے بعد پھر حجرہ میں آکر صوفیا اور مشائخین کرام کی کتابیں مثلاً تذکرۃ الاولیا نفحات، اور رشحات وغیرہ کا مطالعہ فرماتے، تیسرے پہر وضو فرما کر نماز عصر کے لیے برآمد ہوتے، اس وقت پھر ارادت مند حاضر ہوتے اور آپ کی فیض بخشی کا سلسلہ شروع ہو جاتا، نماز عصر کے بعد میر عرب یا کوئی اور مرید تصوف کی کوئی کتاب جیسے سلسلۃ العارفین وغیرہ آپ کے سامنے پڑھتا، حضرت اس کے معنی بتاتے جاتے، جو مرید شغل باطن میں مشغول ہوتے، انکو اس سے بڑا فائدہ پہنچتا مغرب کی نماز تک یہ سلسلہ جاری رہتا، اس کے بعد آپ حجرہ تشریف لے جاتے، حجرہ میں صرف ضرورت کے وقت چراغ جلتا تھا، ورنہ روشنی نہ ہوتی، نماز عشاء سے کچھ پہلے برآمد ہو کر مسجد میں تشریف لاتے، اور لوگوں کی آمد کا انتظار فرماتے، نماز سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر مسجد ہی میں ٹھہرے رہتے، تکیہ کے بعض فقرا اپنے قرتے لاتے، ان پر تکبیر فرما کر آپ پھر حجرہ میں تشریف لیجاتے، جو خادم ساتھ ہوتے، آپ کی آنکھوں میں سرمہ لگانے کے بعد باہر ہو جاتے، اور حضرت اندر سے حجرہ بند کر لیتے، تیس بتیس سال تک حضرت کی زندگی کا یہی معمول رہا،

حضرت بابا شاہ مسافر شرع کے سخت پابند تھے کسی خلاف شرع فعل کو کسی حال میں برداشت نہ فرماتے تھے، تکیہ میں ایسی باتوں کا ذکر ہی کیا ہو سکتا تھا، اگر تکیہ کے قریب کوئی مسلمان شراب پی کر گزر جاتا تو آپ اس پر شرعی حد لگانے میں تامل نہ فرماتے تھے، پابندی شریعت کے سوا اور آداب کا بھی آپ بڑا لحاظ رکھتے تھے، آپ کے پیر حضرت بابا پلنگ پوش تک آپ کی اس اقتباس کا احترام فرماتے اور آپ کے سامنے کبھی سر برہنہ ہو کر بے تکلف نہ بیٹھتے تھے،

حضرت بابا شاہ مسافر نہ صرف بہت بڑے صاحب باطن شیخ تھے، بلکہ ایک بہت بڑے

عالم دین بھی تھے، اس دور میں یہ دونوں باتیں کم ہی ایک جگہ جمع دیکھنے میں آتی تھیں، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، ملفوظات نقشبندیہ میں آپ کا ایک شعر نقل ہوا ہے، جو آپ یتیموں کی حاضری کے وقت ان کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

پسر ہر کہ بدیدم پسر خود گفتم | مفلس از بہر ہمانم کہ یتیماں دارم

حضرت بابا شاہ مسافر کی پاک اور پاکیزہ زندگی کی وجہ سے آپ کا حلقۂ ارادت بہت وسیع ہو گیا تھا، آپ کے ارادت مندوں میں غربا سے لیکر اس عہد کے بڑے بڑے صاحبان اقتدار تک شامل تھے، جس طرح نواب غازی الدین خاں کو بابا پلنگ پوش سے عقیدت تھی اور ایسے ہی نواب صاحب کے جانشین نواب قمر الدین خاں آصف جاہ اول کو حضرت کے جانشین حضرت بابا شاہ مسافر سے تھی، دکن کے گورنر کی حیثیت سے جب آصف جاہ اول اورنگ آباد آئے تو اکثر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، اسی طرح آصف جاہ اول کے امرا کو بھی آپ سے عقیدت تھی، تزک تاز خاں ایک امیر نے حضرت کے انتقال کے بعد پن چکی کی موجودہ مسجد اور خانقاہ بنوائی، حضرت کا مزار اور گنبد حضرت آصف جاہ اول نے تعمیر کرایا، اور خانقاہ کے خرچ کے لیے ایک بڑی جاگیر عطا کی،

شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا بہادر شاہ تخت نشین ہوا، تو دوسرے بھائیوں نے بغاوت کی، شاہزادہ محمد کام بخش نے حیدرآباد اور بیجاپور کے علاقے میں اپنی بادشاہت قائم کر لی، بہادر شاہ نے اس بغاوت کو دبانے کے لیے دکن کا رخ کیا، اس کے ایک درباری ہفت ہزاری امیر نیاز علی المخاطب بہ قلیج محمد خاں کو بابا شاہ مسافر سے بڑی عقیدت تھی، وہ ہر مہینے ڈیڑھ سو روپیے نیاز کے لیے حضرت کے پاس بھیجا کرتا تھا، جب بہادر شاہ نے شاہزادہ کام بخش پر فتح یاب ہو کر پائے تخت دہلی کا رخ کیا تو راستے میں کچھ دن اورنگ آباد

میں بھی قیام کیا، قلیچ محمد خان کی زبانی حضرت باباشاہ مسافر کے زہد و تقویٰ کا حال سن کر بہادر شاہ کے دربار کے امرا آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، بہادر شاہ کا بیٹا شاہزادہ محمد جہاندار شاہ بھی پاپیادہ بارگاہ میں حاضر ہوا، خود بہادر شاہ نے اپنے وزیر اعظم کو آپ کی خدمت میں بھیجکر حاضری کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا جس طرح اور لوگ آتے ہیں وہ بھی بے تکلف آسکتے ہیں، لیکن فقیروں سے بادشاہوں کا کیا کام، اس طرح کی ملاقاتوں سے فقیروں کا وقت خراب ہوتا ہے، جب بہادر شاہ لوٹ کر دہلی چلا تو قلیچ محمد خاں نے اورنگ آباد کے نواح میں اپنی جاگیر کے تمام پرگنے یعنی قصاب کھیڑہ اور آلیورہ کو خانقاہ کے فقرا کے خرچ کے لیے قبول کرنے کی درخواست کی، اور دہلی پہنچ کر بادشاہ سے اس کا فرمان حاصل کرکے آپ کی خدمت میں روانہ کردیا،

اورنگ آباد گزیٹیر میں لکھا ہے کہ حضرت باباشاہ مسافر شہنشاہ اورنگ زیب کے پیر تھے، میاں بشیر الدین نے اپنی کتاب تاریخ بیجاپور کے تیسرے حصہ میں بھی یہ بات دہرائی ہے، بعد کی اور کتابوں میں بھی یہ روایت ملتی ہے، لیکن حضرت کے حالات پر ہماری معلومات کا سب سے مستند ماخذ آپ کے اولین خلیفہ باباشاہ محمود کی لکھی ہوئی کتاب "ملفوظات نقشبندیہ" ہے، اس کتاب میں حضرت کے شہنشاہ اورنگ زیب سے ملنے تک کا ذکر نہیں ملتا، اسکی مریدی اور ارادت مندی تو بڑی بات ہے، اگر ایسا ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس کا ذکر اس کتاب میں نہ آتا۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی جو بارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے عالم ہیں، ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے پہلی بار اورنگ آباد ۱۱۴۰ھ میں تشریف لائے اور کچھ دن قیام کرنے کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کے لیے چلے گئے، اس وقت حضرت باباشاہ مسافر کے انتقال کو چودہ سال ہوچکے تھے، دوسری بار آزاد ۱۱۵۲ھ میں اورنگ آباد آئے اور اپنے انتقال

۱۲۰۰ھ تک کوئی نصف صدی تک یہاں مقیم رہے، انھوں نے سرو آزاد، مآثر الکرام اور خزانۂ عامرہ وغیرہ بہت سے اہم اور مستند تذکرے لکھے ہیں، مآثر الکرام میں حضرت باباشاہ پلنگ پوش، حضرت باباشاہ مسافر اور آپ کے اولین خلیفہ باباشاہ محمود کے حالات ہیں، باباشاہ محمود سے تو آپ کی گہری دوستی تھی، مگر وہ بھی اورنگ زیب کی حضرت باباشاہ مسافر سے ارادت مندی کے بارے میں بالکل خاموش ہیں، اس لیے یہ روایت بالکل بے بنیاد ہے،

۱۱۲۵ھ کے آخری مہینوں میں حضرت باباشاہ مسافر بیمار ہوئے، بڑھاپے کے بہت سے امراض نے آپ کو گھیر لیا، مریدوں اور ارادت مندوں کا دل رکھنے کے لیے دوا بھی استعمال کرتے تھے، لیکن کسی دوا سے فائدہ نہ ہوا، فرماتے تھے جو اس کی مرضی ہوگی وہی ہو کر رہے گا، انتقال سے کچھ دن پہلے آصف جاہ اول مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے، حضرت چارپائی پر بیٹھے تھے، آصف جاہ اول کو بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیا، اور اپنی ایک دستار جو کئی بار سر پر باندھ چکے تھے، طلب کی اور اس کو ٹھیک کرکے نواب صاحب کے ہاتھ میں دیدی، حضرت آصف جاہ اول نے ادب سے اس پگڑی کو اپنے سر پر رکھ لیا، انتقال سے دو روز پہلے آصف جاہ حاضر ہوئے اور حضرت کا ضعف دیکھ کر رونے لگے، اور آپ کے پیر پکڑ لیے، حضرت نے انکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، آصف جاہ اول نے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اور فاتحہ کی استدعا کی، حضرت نے فاتحہ پڑھنے کے بعد نواب صاحب کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر یہ دو شعر پڑھے،

اے سلیماں در میان جغد و باز
علم حق شو با ہمہ مرغاں بساز

مرغ خیرے را زبان خیر گو
مرغ پر بشکستہ را آئہ جیر گو

یہ شعر سن کر حضرت آصف جاہ اول پر رقت طاری ہوگئی، ان کے رخصت ہونے کے بعد حضرت نے فرمایا ان شاء اللہ ایک عالم اس عزیز سے فیضیاب ہوگا، یہ آپ کی دعا کی برکت

ہی تھی جس سے پچ ڈھائی سو سال تک دودمان آصفیہ سے ایک عالم فیضیاب ہوتا رہا۔

جوں جوں انتقال کا وقت قریب آتا گیا، حضرت باربار ہدایت فرماتے رہے کہ خانقاہ میں جس قدر نقد، جنس اور اسباب ہو وہ محتاجوں میں بانٹ دیا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں سب تقسیم کر دیا گیا، کتابیں تک بانٹ دی گئیں، ایک بوریا رہ گیا تھا وہ بھی کسی محتاج کو دے دیا گیا، اس کے بعد آپ نے اطمینان کا سانس لیا، چہارشنبہ کے دن ۱۱۲۶ھ کے رجب کی پانچ تاریخ کو آپ نے مغرب کی اذان سن کر لاالہ الا اللہ فرمایا، اور اسی کے ساتھ واصل بحق ہوگئے، انتقال کے بعد خانقاہ ہی کے احاطے میں اپنے پیر بابا پلنگ پوش کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے، آپ کے ایک ارادتمند مرزا عنایت بیگ رند جانی المتخلص بہ راجی نے آپ کی وفات کا قطعۂ تاریخ کہا، یہی قطعہ گنبد مبارک کے دروازے کے اوپر دیوار میں کندہ کر دیا گیا ہے،

مسافر شاہ ارباب معارف　　　مقیم عرش شد از فرش ایں طاق
خرد تاریخ سال رحلتش گفت　　　مسافر شد ز عالم قطب آفاق
۱۱۲۶

اپنے پیر حضرت بابا پلنگ پوش کی طرح حضرت بابا مسافر نے بھی پوری عمر تجرد میں گذاری،

اورنگ آباد گزیٹیر میں آپ کا سنہ وفات ۱۱۱۱ھ لکھا ہے، جو غلط ہے، یہ حضرت باباشاہ مسافر کا نہیں، حضرت بابا پلنگ پوش کا سنہ وفات ہے،

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے حضرت باباشاہ مسافر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے چند شعر ان کی کتاب مآثر الکرام سے یہاں درج کیے جاتے ہیں،

قطب زماں صاحب شان عظیم　　　شاہ مسافر بہ درِ حق مقیم

خسرو بے تاج و نگین و علم　　　تاج دہ قیصر و خاقان و جم
ریشہ بہ اسرار حقیقت دواند　　　دامن ہمت بہ دو عالم فشاند
خوشگنی ہا اثر ذکر او　　　روشنیِ دل اثر فکر او
بادشہ سلسلۂ نقش بند　　　یک نظر او دو جہاں را بسند
روضۂ او حاجت عالم روا　　　تکیۂ او جنت راحت فزا

ہر سال رجب کی چار تاریخ سے آپ کے عرس کی تقریب شروع ہو جاتی ہے، اور بڑے دھوم دھام سے یہ عرس منایا جاتا ہے، آخری سجادے صاحب کے دنوں میں عرس کی تقریبیں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں، کئی دن تک فقرا کو کھانا کھلایا جاتا تھا، اور پوری پن چکی چراغاں سے منور رہتی تھی، رجب کی چوتھی تاریخ کو پچھلے پہر صندل مالی سے عرس کا آغاز ہوتا ہے، پانچویں رجب کو چراغاں اور چھٹی رجب کو وداعی سلام وغیرہ، حضرت بابا پلنگ پوش اور حضرت بابا شاہ مسافر نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگ ہیں، نقشبندیہ طریقے میں سماع نہیں ہے، اس لیے عرس کی تقریبوں میں قوالی نہیں ہوتی، نقشبندی فقرا جمع ہوتے ہیں اور اپنے دف پر بعض قدیم دکھنی منظومات گاتے ہیں،

(باقی)

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں، وہ دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،　　　قیمت:- مجلد للعہ، غیر مجلد ہے

منیجر

دلّی اور لکھنؤ کی شاعری

اور

ایک کا اثر دوسرے پر

از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، صاحبِ شعر الہند ضعف پیری کی وجہ سے کئی سال سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے ہیں، مگر ان کے قدر دانوں کو اب بھی ان کے مضامین کی تلاش رہتی ہے، انھوں نے عرصہ ہوا دلّی اور لکھنؤ کی شاعری پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا تھا جو اب تک شائع نہیں ہو سکا، گو نئے ادبی مسائل اور جدید رجحانات نے تنقید شعر و ادب کے نظریات میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے، پھر بھی فنی مباحث کی ضرورت اپنی جگہ قائم ہے، اور اس حیثیت سے مولانا کا یہ مضمون بہت مفید اور تنقیدی فوائد و نکات پر مشتمل ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے، امید ہے کہ اہل نظر طبقہ میں پسند کیا جائے گا۔ "م"

مصحفی اور انشاء پر قدما کی شاعری کا دور ختم ہو گیا، اور اس کے بعد شعرائے متوسطین کا پہلا دور شروع ہوا، جس کی بنیاد لکھنؤ میں ناسخ اور آتش، اور دلی میں مومن، غالب اور ذوق نے ڈالی، لیکن اس دور میں سب سے زیادہ قابل بحث شخصیت شیخ امام بخش ناسخ کی ہے، جنکی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ انھوں نے شعرائے دور قدیم کی سادہ روش کو کلیتہً بدل کر ایک جدید شاعرانہ روش قائم کی، چنانچہ مصحفی اپنے چھٹے دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

بعدہٗ حصۂ نعمت الوان این خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ خان تنہا است

در فقیر ہم رسوخے از تہ دل دارد مقسوم گشت تخلص خود را اسم با مسمیٰ انگاشتہ بطرز بختہ گویان

سادہ کلام در عرصہ قلیل خط نسخ کشید

اس کے علاوہ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی اس قدر مکمل اصلاح کی کہ اس کے بعد کسی جدید اصلاح کی گنجایش باقی نہیں رہی، اردو زبان کا اصلاحی دور اگرچہ شاہ حاتم کے زمانہ سے شروع ہوا، اور اس کے بعد میر اور مرزا نے اس کی تکمیل کی اور مصحفی اور انشاء کے زمانے میں بھی یہ اصلاحی کام جاری رہا، لیکن ان تمام اصلاحات نے عملی صورت بہت کم اختیار کی، کیونکہ شاہ حاتم نے جو اصلاحات کی تھیں، ان پر خود ان کا عمل نہ تھا، مرزا سودا بھی عملی طور پر اپنی اصلاحات کے پابند نہ تھے، ان کی توجہ زیادہ تر مضامین کی طرف تھی، اس لیے جب کوئی نیا مضمون ہاتھ آ جاتا تھا تو وہ الفاظ کی بہت کم پروا کرتے تھے، بلکہ سنسکرت اور بھاکا کے متروک الفاظ تک استعمال کر جاتے تھے، مصحفی اور انشاء کے زمانے میں بھی اگرچہ اردو زبان میں کسی قدر اصلاحیں ہوتی رہیں، لیکن عام طور پر وہی میر و مرزا کے دور کی زبان رائج رہی، اس بنا پر مصحفی اور انشاء کے بعد شیخ ناسخ نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا، تو ان کو نظر آیا کہ ایک دورِ جدید کی بنیاد قائم کرنے کے لیے شاعری کے ساتھ اصلاح زبان کی بھی ضرورت ہے، اس لیے انھوں نے شاہ حاتم کے دور سے لیکر مصحفی اور انشاء کے زمانے تک کی زبان کو سامنے رکھا، اور ہر دور کے قابلِ اصلاح الفاظ کی اصلاح کی، اور ان تمام اصلاحات پر شدت کے ساتھ عمل بھی کیا، اور جس لفظ کو اختیار کر لیا ہمیشہ اسی کے پابند رہے، میر و مرزا نے اصلاح زبان کا کوئی ضابطہ اور دستور العمل نہیں بنایا تھا، بلکہ جس لفظ اور جس ترکیب کو مناسب سمجھتے تھے چھوڑ دیتے تھے، اور جس لفظ اور

جس ترکیب کی ضرورت محسوس کرتے تھے، اس کو بلا تکلف استعمال کر لیتے تھے، تذکرہ جلوۂ خضر میں لکھا ہے کہ قدما نے چند باتیں ایسی اختیار کی تھیں، جن کی وجہ سے کسی مضمون کے باندھنے میں ان کو توقف اور تکلف نہیں ہوتا تھا، مثلاً (۱) حروف رابطہ کا چھوڑ دینا (۲) لفظ ہندی یا فارسی کو مخفف باندھنا، (۳) کسی لفظ کے حروف کو بڑھا دینا یا ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن اور مشدد کو مخفف اور مخفف کو مشدد کر دینا (۴) ہندی، عربی اور فارسی کے الفاظ کو وزن شعر کے پورا کرنے کے لیے بگاڑ کر باندھنا (۵) ثقیل اور غیر ثقیل ہر قسم کے الفاظ کو استعمال کرنا (۶) بوقت ضرورت الفاظ متروکہ کو بھی استعمال کر لینا (۷) کسی خاص لغت کی پابندی نہ کرنا بلکہ مضمون کے لیے ہر زبان کے الفاظ کا استعمال کرنا لیکن شیخ ناسخ نے زبان کی جو اصلاح کی وہ بالکل اٹل تھی، انھوں نے خود نہایت سختی کے ساتھ اس پر عمل کیا اور اپنے تلامذہ کو بھی عملاً اس کا پابند بنایا، اگرچہ موجودہ دور میں ان اصلاحات پر چند اعتراضات کیے جاتے ہیں،

(۱) ایک تو یہ کہ شعرائے دور قدیم مضمون کے پابند تھے لیکن شیخ ناسخ نے الفاظ کی پابندی پر زور دیا، اس لیے شعر کی اصل روح نکل گئی، اور ردیف و قافیہ کی پابندی کیساتھ مضمون اور بھی بہت سے لفظی شکنجوں میں جکڑ گیا،

(۲) دوسرے یہ کہ انھوں نے چند ایسے شاندار الفاظ کو متروک قرار دیا جن کے معانی و مطالب کے ادا کرنے کے لیے ان سے بہتر تو کیا وہ ان کے برابر بھی دوسرا لفظ نہ پیدا کر سکے، مثلاً ڈلک، تڑک، چھپ، جھمکا وغیرہ، تاہم ان کی اصلاحات نے لکھنؤ کی زبان کو ایک مستند اور ٹکسالی زبان بنا دیا، اور شعرائے دلی نے بھی لکھنؤ کی اس فضیلت کا اعتراف کیا، چنانچہ مرزا غالب نے ایک موقع پر دلی اور لکھنؤ کی شاعری کے متعلق یہ رائے

ظاہر کی کہ دلی کا مضمون اور لکھنؤ کی زبان مستند ہے، اور اس کے ثبوت میں تجر کا یہ مصرع پڑھکر

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے

کہا کہ "یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی بلکہ ہجو ہوئی کہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے، شعرائے دور جدید بھی لکھنؤ کی اس فضیلت کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ حسرت موہانی کا شعر ہے،

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دلی کی نمود   تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

اصلاح زبان کے ساتھ شیخ ناسخ نے شعر کے ظاہری قالب کو بھی چند اصول کے سانچے میں ڈھال کر نہایت سڈول اور موزوں بنا دیا، یعنی یہ کہ

(۱) عروض و قافیہ کے اصول کے موافق شعر کا وزن درست ہونا چاہیے،

(۲) معانی و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصول کا لحاظ رکھنا چاہیے اور تنافر و غرابت اور تعقید سے کلام کو پاک ہونا چاہیے،

(۳) قافیہ کے اصول سب برتنے چاہئیں،

(۴) بندش چست ہونی چاہیے، زائد اور بھرتی کے غیر ضروری الفاظ شعر میں نہ آنے چاہئیں،

(۵) جتنے کم الفاظ میں مطلب ادا ہو سکے اتنے ہی فصاحت و بلاغت کے اصول کی پابندی ہوگی،

(۶) شعر میں ذم اور ابتذال کا پہلو نہ نکلنے پائے،

(۷) غزل کی زمینوں میں بھی تصرف کیا، اور ردیف کی بنیاد حروف روابط یعنی "کا"، "کے"، "کو"، "سے"، "نے"، "پر"، "تک" اور حروف اثبات و نفی یعنی ہاں اور نہیں وغیرہ پر رکھی، اسلئے قدرتی طور پر نئی نئی شگفتہ زمینیں پیدا ہو گئیں، جن پر خود انکو فخر تھا،

سب زمینیں ہیں نئی طرحیں ہیں اے یار نئی — روز یاں ریختہ کی اٹھتی ہے دیوار نئی

(۸) قدما کے کلام میں بہت سے فحش اور غیر مہذب الفاظ پائے جاتے تھے، اور ہجو سے گذر کر خود غزل میں بھی اس فحش زبان نے بار پا لیا تھا، لیکن انھوں نے اس قسم کے الفاظ سے زبان کو پاک کرکے اس کو نہایت مہذب اور شایستہ بنا دیا، اور ان کے زمانے میں ہجو گوئی کا بھی خاتمہ ہوگیا، جس کی بدترین مثالیں سودا، مصحفی اور انشا وغیرہ نے قائم کی تھیں،

(۹) بندش کی طرز فارسی کے طرز پر قائم کی جس سے مضامین کے ادا کرنے میں وسعت پیدا ہوگئی، اور شعر کے ظاہری حسن میں بھی اضافہ ہوگیا،

اردو زبان اور اردو شاعری پر شیخ امام بخش ناسخ کے یہ وہ احسانات ہیں جن پر لکھنؤ قیامت تک فخر کرے گا، لیکن زبان، شعر اور شاعری الگ الگ تین لفظ ہیں، اور تینوں کے معنی جدا جدا ہیں، ہم نہایت فراخدلی کے ساتھ شیخ ناسخ کے اس احسان کا اعتراف کرتے ہیں، کہ انھوں نے اردو زبان کی مکمل اصلاح کی، اور شعر کو ایک موزوں قالب میں ڈھال دیا،

لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے اس اصلاح یافتہ زبان میں جو شعر کہے ان میں شاعری بھی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ یہی سوال ہے جس کے جواب میں ان کا دیوان غزل گوئی کا ایک ایسا بدترین نمونہ پیش نظر کر دیتا ہے، جو ہر حیثیت سے قابل اعتراض ہے، ایک تو یہ کہ

(۱) غزل اور قصیدہ کے حدود بالکل الگ الگ ہیں، اور شیخ ناسخ سے پہلے قدما نے ان حدود سے آگے قدم نہیں رکھا تھا، یعنی شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کو قصیدہ اور سادہ خیالات اور صاف و شستہ زبان کو غزل کے لیے مخصوص کر دیا تھا، چنانچہ قائم کہتے ہیں،

گفتگو صاف عجب لطف رکھے ہے قائم — گرچہ ہیں شعر کے واقع میں سب اقسام لذیذ

اگرچہ قدما کے دور میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو غزل میں بھی مضمون آفرینی کرتے تھے، لیکن ان کا کلام بالکل بے اثر اور بے نمک خیال کیا جاتا تھا، محمد حسین کلیم اسی قسم کے ایک شاعر تھے، لیکن میر حسن نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے:

با وجود ایں زود و قوت شاعری نمک در کلام نیافتہ بنا بریں اشعارش اشتہار نیافت

بلکہ اس قسم کے لوگ غزلگو شعراء کے طبقہ ہی سے الگ خیال کیے جاتے تھے، مثلاً صغیر علی مروت ایک مضمون آفریں شاعر تھے اور اس قسم کے شعر کہتے تھے،

مہ رو پہ ترے گیسوے سیہ کے نیچے — خال مشکیں مجھے اس طرح نظر آتا ہے

جس طرح وقت سحر موسم سرما میں غزال — شاخ سنبل کے تلے دھوپ کھڑا کھاتا ہے

لیکن مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان اشعار کو نقل کرکے لکھا ہے،

گاہ گاہے کہ فکر شعر میکند دراں تلاش معنیہاے تازہ میدارد اکثر غزلہائش قصیدہ طور است

اور شیخ ناسخ کا شاعرانہ جرم بھی یہی ہے کہ انھوں نے قدما کی سادہ روش کو چھوڑ کر معانیہاے تازہ کی طرف توجہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اکثر نازک خیالیاں کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہوگئیں اور کلام بے کیف و بے اثر ہو کر رہ گیا، دوسرے یہ کہ

(۲) غزل کے حقیقی عنصر صرف چند روحانی جذبات و احساسات ہیں، اور قدما کی شاعری ان ہی جذبات و احساسات سے لبریز تھی، چنانچہ ولی کہتے ہیں

ولی شعر اپنا سراپا ہے درد — خط و خال کی بات ہے خال خال

میر صاحب فرماتے ہیں،

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

مصحفی اور انشا کے زمانے میں اگرچہ شعر کی اس روحانیت میں کسی قدر فرق آگیا تھا،

اور کچھ ظاہری چیزیں بھی غزل کا جزو بن گئی تھیں، مثلاً

جب تو نے جمائی تھی دھڑی مسی کی کافر ۔۔۔ واللہ اسی دن مرا ایمان گیا تھا

حسن کی آرایش ایسی بھی نہ تو آسان سمجھ ۔۔۔ لاکھ نتھ ٹوٹیں جب اس کے کان کا بالا بنا

عشق اس ناف کا نہیں اچھا ۔۔۔ ڈوبتی ہے بھنور میں جا کر ناؤ

لیکن بایں ہمہ غزل میں وہی روحانی عنصر غالب رہا، جو قدما کے دور کی ایک عمدہ یادگار تھا، لیکن شیخ ناسخ نے اس عمدہ روش کو چھوڑ کر خارجی مضامین سے اپنا دیوان بھر دیا، مثلاً

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا ۔۔۔ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

شکم صاف کے قریں ہے کمر ۔۔۔ یا ہے مخمل پہ خواب مخمل کا

یہ چند اشعار مشتے نمونہ از خروارے ہیں، ورنہ ناسخ کا پورا دیوان اسی قسم کے اشعار سے بھرا ہوا ہے، اور اس قسم کے اشعار میں اس وقت اور بھی زیادہ بد نمائی پیدا ہو جاتی ہے. جب ان سے ابتذال اور زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً

جلد زنگ لے دیدۂ خونبار اب تار نگاہ ۔۔۔ ہے محرم اس پری پیکر کو ناڑا چاہیے

کا فرخط استوا بدن کا ۔۔۔ تیرے سونے کی کردھنی ہے

استرہ منہ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ہے بجا ۔۔۔ محو دیدار ہے کیونکر خط قرآن ہوتا

(۳) تیسرے یہ کہ قدما کے دور تک غزل صرف عشق و محبت کے جذبات تک محدود تھی، فلسفہ اور اخلاق وغیرہ کے مضامین غزل میں بہت کم شامل کیے گئے تھے، لیکن شیخ ناسخ نے عاشقانہ طرز کو کم کر کے ہر قسم کے مضامین کو غزل میں شامل کر لیا، جس کا ظاہری طور پہ قابل تعریف پہلو تو یہ ہے کہ اس سے غزل گوئی کے دائرے میں وسعت پیدا ہو گئی. لیکن درحقیقت اس طرز نے غزل کو سرے سے غزل ہی باقی نہیں رکھا، اور ایک ایسی شاعری

پیدا ہو گئی جو کسی صنفِ سخن میں بھی داخل نہیں ہو سکتی، چنانچہ مولوی سید امداد امام اثر کاشف الحقائق میں لکھتے ہیں:

وہ خیالات شیخ کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل ہو گئے جو درحقیقت احاطۂ غزل سرائی سے باہر ہیں، اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ واردات و جذبات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلیں معرا ہو گئیں اور غزل سرائی کا مطلب فوت ہو کر ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد ہو گئی جس پر نہ قصیدہ گوئی اور نہ غزل سرائی دونوں سے کسی کی تعریف صادق نہیں آتی ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ انھوں نے ان تمام برائیوں کو بھی بہت زیادہ نمایاں کیا جو قدما کے زمانے میں پیدا ہو گئی تھیں،

(۴) مثلاً: رعایت لفظی یا ضلع جگت جو قدما کے دور اول کی ایک یادگار تھی، اور جس کی اصلاح مرزا مظہر جانجاناں اور سودا وغیرہ نے کی تھی، اس کو شیخ ناسخ نے اپنے زمانے میں دوبارہ زندہ کیا، اور لکھنو میں اس کے زندہ ہونے کے چند قدرتی اسباب بھی موجود تھے، سید انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ لکھنو میں چند لوگوں نے ضلع بولنے میں کمال پیدا کر لیا تھا، اور رنگین کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ طرار معشوق بھی جو غالباً زنان بازاری کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس فن کے مشاق استاد تھے، چنانچہ وہ کہتے ہیں،

گر جگت بولے تو پرکالۂ آتش ہو زباں ۔۔۔ اور جو رک جائے تو کہنے میں رکاوٹ خاصی

ضلع کے علاوہ وہ دو بے جوڑ چیزوں میں ایک ایسے لفظ سے مناسبت پیدا کر لیتے تھے، جو دونوں میں مشترک ہوتا تھا، مثلاً اس سوال کے جواب میں، کہ کنوئیں اور آتش بازی میں کیا نسبت ہے، کہتے تھے کہ "چرخی"، اس کے بعد انھوں نے اس کی بکثرت مثالیں درج کی ہیں:

جن میں سے ہم صرف مناسباتِ دریا کے متعلق چند فقرے درج کرتے ہیں،

آپ کا بجرہ آج کھل گیا ہے، واللہ تمھاری بات پانی مشکل ہے، کل سوتا چھوڑ گئے

ہرچند ضعف نالی کی جگہ ندی ایک باولی رنڈی کے کہنے سے ہماری چاہ دل سے اٹھادی۔

اس مختصر سی عبارت میں بجرہ، پانی، سوتا، نالی، ندی، باولی اور چاہ کے الفاظ باہم ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں، لیکن باایںہمہ خود مصحفی اور انشا کے زمانے تک اس کا اثر اردو شاعری پر بہت کم پڑا، لیکن ناسخ کے زمانے میں اس بدعت نے بہت زیادہ رواج پایا، اور بعد کو امانت لکھنوی اس شریعت کے خاتم المرسلین قرار پائے، چنانچہ ان کے الہامی صحیفہ کی چند آیتیں یہ ہیں:

بوسہ مانگا تو لائے ذکر پتنگ   پیچ سے کاٹ دی ہماری بات

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت   بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

(۵) یا مثلاً مسلسل گوئی جس کی ابتدا جرأت نے کی تھی، اس نے شیخ ناسخ کے زمانے میں اس قدر ترقی کی کہ غزل گویا قصیدہ بن گئی، اس دور میں شعراے لکھنؤ ایک ہی زمین میں دو دو تین تین، چار چار غزلیں کہتے تھے، اور اس لے کے بڑھانے کے لیے

(۱) ہر قسم کے قافیے باندھتے تھے، جن سے بہت سے مبتذل مضامین پیدا ہو جاتے تھے،

(۲) عام طور پر ایک قافیہ صرف ایک ہی پہلو سے حسن کے ساتھ بندھ سکتا ہے، لیکن مسلسل غزلوں کے لکھنے کے لیے ایک ہی قافیہ کو بار بار باندھتے تھے، اس لیے خواہ مخواہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار کی بھرمار ہو جاتی تھی،

یہ تمام خصوصیتیں اگرچہ اس دور کے تمام شعراے لکھنؤ کے کلام میں پائی جاتی ہیں، تاہم ناسخ اور تلامذۂ ناسخ کا دامن ان کانٹوں میں بہت زیادہ الجھا ہوا تھا، چنانچہ مرزا قادر بخش

صابرؔ تذکرۂ گلستانِ سخن میں ان کے کلام پر طنزاً ان الفاظ میں ریویو کرتے ہیں،

معنی پست اس کی طبع کی اوج بخشی سے بلند، اور الفاظ کروہ اس کی تراکیب کے حیلہ سے دل پسند، اگر غریب نوازنہ ہوتا تو معنی کی طرف اس قدر التفات نہ کرتا اور اگر آشناپروری منظور نہ ہوتی تو الفاظ کی اتنی رعایت نہ کرتا، معنی مبتذل اس کے تصرفات سے غریب، اور اوج فلک اس کے فکر کے سامنے نشیب، متانت مزاج سے مضامین شوخ باوجود آمد کے آورد کے محتاج، اور رنگین طبیعت سے معانی برجستہ کو خادتِ خیال سے دروازۂ لب تک آنے میں تکلف کی احتیاج۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناسخ اور ان کے تلامذہ کے ان مبتذل، مکروہ، خشک بے کیف اور بے اثر مضامین نے لکھنؤ کی شاعرانہ فضا کو اس قدر تیرہ و تار بنا دیا کہ اگر آتشکدۂ آتش کی چند اڑتی ہوئی چنگاریوں نے اس میں کسی قدر روشنی نہ پیدا کر دی ہوتی تو یہ خوشنما شہر قیامت تک اسی اندھیرے میں بھٹکتا پھرتا، لیکن اسی کے ساتھ خواجہ آتش کا کلام بھی ان معائب سے بالکل محفوظ نہیں ہے جو اس دور میں عام طور پر پیدا ہو گئے تھے، تاہم ان کے کلام میں چند خوبیاں ایسی ضرور موجود ہیں جن کی وجہ سے اس میں تاثیر اور دلآویزی پیدا ہو گئی ہے۔

(۱) ایک تو یہ کہ زبان نہایت صاف و شستہ ہے، اور اشعار رواں اور بندشیں چست ہیں، مثلاً

کہتے ہیں ذکر لیلیٰ و مجنوں جو چھیڑیے   چپ رہیے بس نہ قبر کے مردے اکھیڑیے

باراں کی طرح لطف و کرم عام کیے جا   آیا ہے جو دنیا میں تو کچھ کام کیے جا

غمزے نے اسے سروگل اندام کیے جا   جو کام ہے معشوق کا وہ کام کیے جا

قصۂ سلسلۂ زلف نہ کہنا بہتر   پیچ در پیچ ہے خاموش ہی رہنا بہتر

ٹیڑھے سیدھے سے غرض رکھتے نہیں اے آتش
جو کہے یار ہمیں سن کے یہ کہنا بہتر

خواجہ صاحب کو خود بھی اس پر ناز ہے،

ہلا دیں دل نہ کیونکر شعر آتش
صفا بندش، معانی خوبصورت

(۲) دوسرے یہ کہ رندانہ مضامین کو وہ اس جوش و سرمستی سے ادا کرتے ہیں کہ خواجہ حافظ کے لب و لہجہ کا دھوکا ہوتا ہے، مثلاً

کام ہے شیشہ سے ہم کو اور ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شراب روح پرور سے غرض

جان و کار جہاں سے ہوں بیخبر میں مست
زمیں کدھر ہے، کہاں آسمان نہیں معلوم

شیشے رہیں شراب کے آٹھوں پہر کھلے
ایسا گھرے کہ پھر نہ کبھی ابر تر کھلے

سبوے غنچہ ہے معمور، جام گل لبریز
ٹپک رہی ہے شراب ابر نوبہاری سے

(۳) تیسرے یہ کہ ان کے کلام میں ایک فقیرانہ اور آزادانہ شان پائی جاتی ہے، اور توکل و قناعت، استغنا و بے نیازی اور فقر و فاقہ کے مضامین کو اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ دل پر ان کا خاص اثر پڑتا ہے، مثلاً

کام رہنے کا نہیں بند اپنا
بندہ پرور ہے خداوند اپنا

چکھا کے خوان کا اپنے نمک، توکل نے
زباں کو مزۂ لقمۂ حلال دیا

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پسارئیے

دنیا سے بے نیاز قناعت نے کر دیا
اکسیر کا جو کام تھا اکسیر سے ہوا

ہم فقیروں کو ہے دیوار کا سایہ کافی
خوش رہیں وہ کہ جو خسخانہ میں آرام کریں

فقر کے کوچے میں قدر دولت دنیا نہیں
ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس سے پتھر سیکڑوں

اسی فقیرانہ شان نے ان کے کلام میں شجاعت و جوانمردی کے جوہر پیدا کیے ہیں، جن کا

اظہار وہ نہایت جوش و ولولے سے کرتے ہیں،

اللہ ہے مشکل میں مددگار ہمارا
اعوان سے انصار سے کیا کام ہے ہمکو

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے، نہ تاج و تخت
ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا

ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی
رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا

بغل میں لیکے یوسف کو اکیلے واں سے گذرا میں
قدم رکھتے ہوئے جس راستے میں کارواں کھٹکا

(۴) چوتھے یہ کہ لکھنؤ کی شاعری اگرچہ خواجہ صاحب کے زمانے میں زلف و کاکل کے پھندے میں الجھ کر رہ گئی تھی، اور خود خواجہ صاحب بھی اس پھندے میں پھنس گئے تھے، تاہم جب وہ زلف و کاکل کے حلقہ سے نکل کر جذبات کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی شاعری عشق و محبت کے رموز و اسرار کا آئینہ بن جاتی ہے، مثلاً

کسی دن تو ہوا ہے یوسف لقا تازہ دماغ اپنا
کبھی تو راہ ادھر بھی تیری بوے پیرہن بھولے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

دل کہیں، جان کہیں، چشم کہیں، گوش کہیں
اپنے مجموعہ کا ہر ایک ورق برہم ہے

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

بہت آتا ہے یاد اے صبر مسکیں
خدا خوش رکھے تجھکو تو جہاں ہے

(۵) پانچویں یہ کہ خارجی مضامین یعنی خال و خط اور زلف و کاکل وغیرہ کے مضامین سے اگرچہ شیخ ناسخ کی طرح ان کا دیوان بھی بھرا ہوا ہے، تاہم وہ اپنے طرز ادا سے ان مضامین میں بھی بہت کم دلچسپی اور لطافت پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً

شش جہت میں نہیں اس روے کتابی کا نظیر
معنی نو ہیں ہر اک فقرے میں دو چار جدا

حافظ رخ کتابی محبوب کے ہیں ہم
یہ احسن القصص ہے ہمیں یاد ہو گیا،

لے حور اپنے سیب ذقن کا نہ حال پوچھ — جنت کا میوہ مغز سے ہو پوست تک لذیذ

مصحفِ رخ کی تلاوت ہو نہایت مشکل — اس میں لے قاریو زیر و زبر و پیش نہیں

(۶) چھٹے یہ کہ ان کی تشبیہات نہایت سادہ، مگر اسی کے ساتھ نہایت لطیف ہوتی ہیں، مثلاً

گرد ہوا تو اسے چھوٹنا محال ہوا — دلِ غریب مرا مفلسوں کا مال ہوا

نقش و نگارِ حسنِ بتاں کا نہ کھا فریب — مطلب سے خالی جان لے تو یہ عبارتیں

حسرت ہی آنکھ کو رہی اس سبز رنگ کی — ریحان ہوا ہرا نہ کبھی اس سفال میں

نکلیں جو اشک لے اثر آنکھوں سے کیا عجب — پیدا ہوئے ہیں طفل ہزاروں مرے ہوئے

لکھا جو ہے جواب خطِ شوق یار نے — قاصد کا مثل رقعۂ شادی ہو رنگ سرخ

اب کی بہار میں تو مجھے پار اتار دے — کشتی مے وہ آئے امید و بیم سے

ملک الموت نے پیری میں کرم فرمایا — کشت پختہ ہوئی آتش کہ محصل دوڑا

سمجھے تو رنج و راحت بلبل ہے مدعا — اس مطلع دو لخت خزان و بہار سے

اور بعض اوقات وہ ان ہی سادہ اور لطیف تشبیہوں سے خارجی مضامین کو بھی بہت کچھ لطیف اور خوشگوار بنا دیتے ہیں، مثلاً

اس خال اس ابرو کی ہمیں خوب خبر ہو — یہ گوئے سعادت ہو وہ چوگان ظفر ہے

تمھارے روبرو پھیکا رخِ شمس و قمر دیکھا — وہ نان بے نمک پایا یہ شیر بے شکر دیکھا

اس طفل مہ جبیں نے جو رکھی کلاہ کج — پیر فلک نے پھینک دی دستارِ آفتاب

رخسارے رہا دہنِ یار ناپدید — مطلب دقیق تھا نہ سمایا کتاب میں

لیکن خواجہ آتش کی ان خصوصیات کے مقابل میں شیخ ناسخ کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) جا بجا نہایت ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً

مل گیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے — ہوں جو عیسیٰ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا

(۲) فارسی اشعار کا سرقہ یا ترجمہ کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں، لیکن انھوں نے جن اشعار کا ترجمہ کیا ہے وہ بالکل ترجمے کے قابل نہیں اور اسی سے ان کی بد مذاقی کا پتہ چلتا ہے، مثلاً

مسی آلودہ لب پر رنگ پان ہو — تماشا ہے تہ آتش دھواں ہے

(۳) عموماً خیال بندی کرتے ہیں جو اکثر کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہوتی ہیں، مثلاً

میری آنکھوں نے تجھے دیکھ کے دیکھا تو — کہ زبانِ مژہ پر شکوہ ہے بینائی کا

لیکن بایں ہمہ ان کے کلام کے بعض حصے ایسے بھی ہیں جن میں صفائی، شستگی، سادگی، برجستگی اور کیف و اثر سب کچھ موجود ہے، بالخصوص اخیر عمر میں آتش کی ریس میں انھوں نے اس طرف زیادہ توجہ کی ہے، اس لیے ان کے دوسرے دیوان میں اس قسم کے اشعار زیادہ ملتے ہیں، بعض انشا پردازوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے عمر بھر میں صرف گیارہ شعر لکھے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک اگر ان کے دیوان کا انتخاب کیا جائے تو کم از کم چار جزو کا ایک چھوٹا سا دیوان تو ضرور مرتب ہو جائے گا، جس پر غالب کو فخر تھا، اس موقع پر ہم ان کے چند منتخب شعر نقل کرتے ہیں۔

نامہ بر ہے نامۂ احباب ہے — ہائے بیداری ہو یہ یا خواب ہے

عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن — آگ میں پڑ جائے جو شے آگ ہے

روٹھے ہوئے تھے آپ کئی دن سے من گئے — بگڑے ہوئے تمام مرے کام بن گئے

دل کو خوش آتی ہیں صحرا کی ہوائیں پر خار — اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں

مردوں کو جلاتی ہے تری ناز کی آواز — اعجاز کا اعجاز ہے آواز کی آواز

تیرے ہی نام کی ایجان ہے بس گنجایش — وسعتِ دل بھی ہے مانند نگیں تھوڑی سی

میری تربت ہے، ادھر کو گذر اے جان کرو — خاک کو جسم کرو، جسم کو پھر جان کرو

نہیں ممکن تخم گردوں میں ٹھہرنا میرا — مستیٔ عشق سے وہ بادۂ سرجوش ہوں میں

جز قتل کیا ہے عشق کے بیمار کا علاج — سو آپ روز کرتے ہیں دو چار کا علاج

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں — ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

بھول کر او چاند کے ٹکڑے ادھر آ جا کبھی — میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

نہ سجدۂ در جاناں سے سر اٹھاؤں گا — یہ وہ نماز ہے جس کا کبھی سلام نہیں

اس قسم کے عاشقانہ مضامین کیساتھ انھوں نے جابجا رندانہ مضامین بھی نہایت جوش و سرمستی سے ادا کیے ہیں، مثلاً

صباح عید ہوئی ساقیا شراب چلے — نہ بیشتر کہیں ساغر سے آفتاب چلے

ناسخ شراب پی شب تاریک ہو تو ہو — روشن ہیں صحن باغ میں ہر سو چراغ گل

صراحی کہتی ہے مجھ سے کہ مغتنم ہے یہ دور — پیالی متصل لے بادہ خوار لیتا جا

جھک جھک کے شیشے ملتے ہیں ہنس ہنس کے جام سے — یہ میکدہ مقام نہیں ہے غرور کا

خم سے شیشے میں تو شیشے سے قدح میں ساقی — بند نہروں کی طرح بادۂ انگور چلے

آتی جاتی ہے جا بجا بدلی — ساقیا جلد آ ہوا بدلی

مولوی محمد حسین آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ ان کے کلام میں تصوف بھی ہے، مگر اسکا رستہ کچھ اور ہے جس سے وہ واقف نہیں، لیکن ہمارے نزدیک وہ اس کوچہ سے بالکل نابلد نہیں ہیں،

سودائے عشق غیر کہاں ہے برنگ گل — اپنے ہی حسن پر میں گریباں دریدہ ہوں

ہرگز مجھے نظر نہیں آتا وجود غیر — عالم تمام ایک بدن ہے میں دیدہ ہوں

سودائے عشق غیر کہاں ہے برنگ گل — اپنے ہی حسن پر میں گریباں دریدہ ہوں

ہرگز مجھے نظر نہیں آتا وجود غیر — عالم تمام ایک بدن ہے میں دیدہ ہوں

عالم ہے محو آئینہ خانہ کی سیر میں — اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں

کب اس چمن میں ہے صورت سے کام جز معنی — کہ ہم نے مثل صبا رنگ سے جدا کی بو

بعض موقعوں پر وہ فلسفہ اور علم کلام کے مسائل کو بھی نہایت خوبی سے ادا کر جاتے ہیں، مثلاً

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر — بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

تمام صفحۂ عالم ہے ایک ہی صفحہ — سر کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں

اے وجود چمن آرائے ازل کے منکر — خود بخود گل ہوئے موجود نہ خار آپ سے آپ

دونوں عالم میں اگر ایک نہیں شعبدہ باز — جمع کیونکر ہوئے اضداد یہ چار آپ سے آپ

کہیں کہیں ان کے استعارات و تشبیہات میں سادگی آمیز لطافت بھی موجود ہے، مثلاً

سرو کو اس قد موزوں سے بھلا کیا نسبت — کہ معانی سے ہے یہ مصرع مہمل خالی

کی جو خیاط ازل نے تری پوشاک درست — بچ رہے قطع میں یہ شمس و قمر دو ٹکڑے

وہ نہیں آتے تو مانند چراغ مردہ — شب تاریک میں بیٹھا ہوں اکیلا خاموش

یار آیا تو ہوئے دیدۂ ناکام سفید — جیسے ہوں آمد سلطاں میں در و بام سفید

اگر نہیں ہے خوش آیند بوے مے تو نہ ہو — نہیں ہے عیب اگر ہو بری دوا کی بو

غرض انکے منتخب کلام میں خواجہ آتش کی تمام خصوصیات موجود ہیں، لیکن یہ تمام پھول خس و خاشاک کے ڈھیر میں اس طرح گم ہو گئے ہیں کہ صرف ایک متجسس دیدہ ور ہی کو نظر آ سکتے ہیں، اسلیے ان کے کلام پر صحیح تنقید وہ ہے جو مرزا غالب نے کی ہے، یعنی یہ کہ ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ملتے ہیں،

(باقی)

تذکرہ خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار

مؤلفہ

تقی الدین محمد کاشانی کے چند مخطوطے

ایران کے کتاب خانوں میں

از

جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی مقیم تہران (یونیورسٹی)

خلاصۃ الاشعار فارسی شعرا کا نہایت اہم تذکرہ ہے، جس کے مؤلف تقی الدین محمد نے اول اول ۹۷۶ھ میں اس کی داغ بیل ڈالی اور ۹ سال کی محنت شاقہ کے بعد ۹۸۵ھ میں اس کی پانچ جلدیں مکمل ہوگئیں، مولف نے اس کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھا اور ۸ سال بعد ۹۹۳ھ میں ایک خاتمہ کا اضافہ کیا، جس میں معاصرین کے حالات جغرافیائی ترتیب سے درج کیے، "برپنج کتاب تقی" "از دوم پنج" سے تاریخ نکلتی ہے، تقی نے اس ۱۷ سال میں جس طرح کی محنت کی ہے اس کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے[1]،

اکنون قریب بچہاردہ سال ست کہ فقیر بعد از مطالعہ کتب متداولہ معقول و منقول از تفنن الٰہی مرتکب انتخاب اشعار متقدمین و متاخرین است و بنوشتن حالات سابقین و

[1] خاتمہ فصل دوم اصل ثانی جو ۹۹۳ھ کے قریب لکھا گیا ہوگا یا کچھ قبل ہی،

لاحقین مشغول و دریں مدت یک لحظہ بفراغ بال نزیست و یک لحظہ ندانست کہ فراغ بال چیست

من اشکِ بیدلاں ماخذہ می پنداشتم روزے   کنوں برمیدہد تخمی کہ من میکاشتم روزے

مؤلف نے یہ کام پورا تو کر ڈالا، مگر اسے پوری طرح سیری نہ ہوئی، معاصرین میں اضافہ کی گنجایش باقی تھی، عمر نے بھی مساعدت کی، چنانچہ نظر ثانی کا سلسلہ شروع کیا، جو ۲۳ سال تک جاری رہا اور ۱۰۱۶ھ میں ایک دوسرا ایڈیشن تیار ہوا، جو چھ مجلدات پر مشتمل تھا، اور "ست مجلدات لازم" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے،

اس تذکرہ کے اجزا یہ ہیں:

(۱) مقدمۂ کتاب (آ) ابتدائیہ (ب) تذکرہ کی ضرورت (ج) فصول چہارگانہ تصوف کے رنگ میں (د) انتخاب اشعار سیدنا حضرت علیؓ (۲) چہار رکن اور ایک خاتمہ،

(آ) رکن اول (مجلد ۱، ۲) ۵۴ قصیدہ گو شعرار کے حالات پر مشتمل ہے، جو عہد سبکتگین سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک گزرے ہیں،

(ب) رکن دوم (مجلد ۳) ۴۳ شاعروں کے حالات کو حاوی ہے، خصوصاً جنھوں نے غزل گوئی میں کمال حاصل کیا تھا،

(ج) رکن سوم (مجلد ۴) ۴۹ نویں اور دسویں صدی کے شاعروں کے حالات پر مشتمل ہے،

(د) رکن چہارم (مجلد ۵) ان ۱۰۱ شاعروں کے حالات ہیں جو سلطان حسین مرزا کے عہد سے مصنف کے زمانے تک ہوئے ہیں،

(ی) خاتمہ میں معاصرین کے حالات ہیں اور وہ ۱۲ اصل میں منقسم ہے، جن میں کاشان کے (۵۴) اصفہان کے (۴۷) قم کے (۱۵) ساوہ کے (۱۴) قزوین کے (۲۴) گیلان کے (۱۸)

تبریز کے (۴۴) یزد کے (۳۸) شیراز کے (۳۲) ہمدان و مضافات کے (۵۴) رے و استرآباد کے (۳۱) خراسان کے (۵۹) شعرا کے حالات بالترتیب درج ہوئے ہیں،

اس تذکرہ[1] کی اہمیت کے پیش نظر راقم الحروف نے معارف ہی کے شمارہ نومبر ۵۲ء میں ایک مقالہ لکھا تھا، اس تین سال کے عرصہ میں اس کے متعلق کچھ اور مفید معلومات جمع ہو گئیں، اور کچھ نئے مخطوطات کا پتہ چلا، اکتوبر ۵۵ء میں ایران آنے کا اتفاق ہوا، تو یہاں بھی اسکے خطی نسخوں کی تلاش جاری رہی اور خوش قسمتی سے بہت اچھے نسخوں کا سراغ مل گیا، اس لیے ان کے متعلق چند سطور ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتا ہوں، مگر قبل اس کے کہ ایرانی نسخوں کا تعارف کرایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول اس کے تمام دوسرے نسخوں کی صراحت کر دی جائے، اس وقت تک صرف حسب ذیل[2] نسخوں کا علم تھا۔

(۱) نسخہ بلند۔ لینڈ لینا، ص ۲۲۳ شمارہ ۳۱۲ مرقومہ ۱۰۳۸ھ۔ ۱۰۳۹ھ اس میں رکن چہارم نہیں ہے، اس نسخہ کی اہمیت اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ اسی کی بدولت مسٹر بلند[3] آنجہانی نے سب سے پہلے خلاصۃ الاشعار کو روشناس کرایا تھا،

[1] خلاصۃ الاشعار کا پہلا اڈیشن شاہ طہماسپ کے نام معنون ہوا، مگر دوسرا اڈیشن شاہ عباس صفوی کے نام ملتا ہے، مثلاً بلند کے نسخہ میں رکن دوم میں شاہ عباس کا نام صراحۃً مذکور ہے لیکن اسی نسخہ کے شروع میں ابراہیم عادلشاہ کا نام پایا جاتا ہے اور اسکے ساتھ ۱۰۰۲ھ درج ہے، مگر بلند نے اسکو ابراہیم عادلشاہ بیجاپوری نہیں مانا ہے، مگر صحف ابراہیم میں صراحۃً لکھا ہے کہ خلاصۃ الاشعار اسی بیجاپوری بادشاہ کے نام پر لکھی گئی، اسکی صحت میں یہ تامل ضرور ہے کہ تقی کاشی ہندوستان آیا کیونکہ ۹۸۶ھ میں وہ اصفہان میں تھا، ۹۹۰ میں نجف میں، ۹۹۲، ۹۹۹، ۱۰۰۲، ۱۰۰۴، ۱۰۱۱، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۶ میں کاشان میں تھا، مجلس میں جو خاتمہ کا نسخہ ہے، اس میں بھی شاہ عباس ہی کا نام پایا جاتا ہے [2] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو سٹوری: پرشین لٹریچر جلد اول حصہ دوم (چھاپ لندن ۱۹۵۳ء) ص ۸۰۳۔ ۸۰۵ [3] رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ج ۹ (۱۸۴۸ء) ص ۱۳۱۔ ۱۳۲

(۲) نسخہ کتاب خانہ اودھ[1]، مشتمل بر مجلد سوم (رکن دوم) و خاتمہ، حجم ۶۰۰ صفحات کتابت ۱۰۰۴ھ

(۳) ایضاً (مکمل)، یہ دوسرے اڈیشن کی تلخیص ہے، جس میں اشعار محذوف ہیں، اسپرنگر کا خیال ہے کہ یہ تلخیص خود مولف نے کی تھی، حجم ۵۰ صفحات اور تاریخ کتابت ۱۰۰۴ھ ہجری ہے۔

(۴) دیوان ہند نمبر ۶۶۷[2]، اس میں رکن چہارم نہیں ہے، تاریخ کتابت ۱۰۳۸ھ

(۵) ایضاً نمبر ۶۶۸[3] خاتمہ، یہ وہی نسخہ ہے جو اسپرنگر کے بیان کے مطابق مسٹر ہال (بنارس) کے پاس تھا، اور جس کا سنہ تصنیف اور سنہ کتابت ۹۹۳ھ ہے،

(۶) بلوچٹ (Blochet) ۳، ۱۴۴۲۔ جزوی از رکن اول،

(۷) بانکی پور، رکن سوم[4] (مجلد چہارم) اس پر تقی نے نظر ثانی کی ہے، اس کے ساتھ ایک تذنیب (ضمیمہ) شامل ہے جس میں ۲۵۰ قدیم و جدید شعرا کا کلام شامل ہے،

(۸) ڈارن (Dorn) ۳۲۱، رکن سوم[5]، سنہ کتابت ۹۳۳ھ درج ہے، جو غلط ہے، لیکن بہت اچھا نسخہ ہے،

(۹) ریو، تتمہ ۱۰۵، مجلد اول (ناقص الآخر)

(۱۰) برلن ۶۶۷ خاتمہ

(۱۱) ″ ۶۶۷ الف ″

[1] اسپرنگر (فہرست) ص ۱۵ [2] دیوان ہند کے دونوں نسخوں کی نقل راقم نے حاصل کر لی ہے اور ایرانی نسخوں کی مدد سے "خاتمہ" کو چھاپنے کا ارادہ ہے [3] ملاحظہ ہو فہرست کتاب خانہ دیوان ہند ص ۴۴۳ [4] فہرست ج ۸ ص ۳، [5] اس میں اہم شاعروں کا حال ہے۔

(۱۲) افناڈ (wanow) تتمہ ۹۳۲، جزوی از رکن سوم

(۱۳) رضا لائبریری رام پور، خاتمہ ناقص الطرفین

(۱۴) پٹیالہ آرکائیوز، رکن سوم (۱۳ شاعر) اور خاتمہ (۷۸ شاعر، اصل اول)

تم ان میں حسب ذیل نسخے میری نظر سے گزرے :

[۱] کتاب خانہ مجلس شورائے ملی، ۳۳۴ (فہرست ج ۲ ص ۱۹۵ - ۱۹۷) یہ نسخہ خاتمہ کے جزو اول پر مشتمل ہے، یعنی اس میں خاتمہ کے بارہ اصلوں میں سے صرف سات اصلوں کے شعرا کا حال اس ترتیب سے درج ہے :

۱ - اصل اول، فصل اول، شعرائے زندہ کاشان (۳۴ شاعر) پہلا محتشم، آخری جلال الدین مسعود[۱]

فصل دوم، شعرائے متوفی کاشان (۱۲ شاعر) پہلا شجاع، آخری عبدل ساکنی[۱]

۲ - اصل دوم فصل اول، شعرائے زندہ اصفہان (۲۰) پہلا ضمیری، آخری شکیبی،

فصل دوم، شعرائے متوفی اصفہان (۲۵)[۲] پہلا حرفی، آخری رمزی،

۳ - اصل سوم، شعرائے قم (۱۵)[۳] پہلا حضوری، آخری وحیدی،

۴ - اصل چہارم، شعرائے ساوہ (۱۴) پہلا حریقی، آخری منصوری،

۵ - اصل پنجم، شعرائے قزوین (۲۲)[۴] پہلا ابراہیم مرزا، آخری میر ہاتفی،

۶ - اصل ششم، شعرائے گیلان (۱۷) پہلا خان احمد مرزا، آخری محمد صوفی

۷ - اصل ہفتم، شعرائے تبریز (۳۲) پہلا حقیری، آخری عبدی،

---

[۱] یہ شاعر اسپرنگر میں نہیں ہے، مگر دیوان ہند میں ہے۔ [۲] اسپرنگر میں ۲۲ ہیں، مگر مولانا حرفی یہاں ہے جو دیوان ہند میں بھی ہے [۳] دیوان ہند کا مشربی اس میں ہے، جو اسپرنگر میں نہیں ہے [۴] اسپرنگر کا فسونی جو دیوان ہند میں نہیں ہے، یہاں موجود ہے۔

اس نسخہ کا کاتب ابن مرزا نظام محمد ہے جس نے بروز سہ شنبہ ۲۳ رجب ۱۰۱۳ھ میں اس کی کتابت کی تھی، جیسا کہ حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہے[۱]:

"تم نصف الاول من مجلد السادس من کتاب خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار بعون الملک الستار علی ید العبد الضعیف النحیف المحتاج الی رحمۃ اللہ الملک اللطیف ابن مرزا نظام محمد شرف الشریف فی تاریخ یوم الاربعاء ثالث والعشرین شہر رجب المرجب سنہ ثلث وعشر والف الہجریہ النبویہ"

اس عبارت کے قبل خود تقی کاشی نے یہ جملے[۲] لکھے ہیں :

"الحمد للہ والمنۃ کہ بتوفیق ملک خلاق قلم تحقیق مسودۂ این اوراق حالات شعرائے دار السلطنت تبریز و نواحی آن در سلک تحریر کشیدہ و اشعار بلاغت نشان فصحائے آں جا را در ذیل اسامی ایشان درج گردانید انشاء اللہ تعالیٰ بار دیگر قلم مشکیں شمامہ از چشمہ دوات رشحہ بخش گشتہ عنان بجانب شعرائے ...... یزد ..... منعطف میگرداند۔"

حجم : ۶۱۴ ورق، ۲۵ سطری، سائز ۲۰ سم × ۱۱ سم، خط نستعلیق، نسخہ نہایت عمدہ حالت میں کتاب خانے کی زینت ہے۔

"ابتداء : حمد و سپاس بعید دا آفریدگارے را سزد کہ نفس ناطقہ را معدن جواہر اسرار معرفت و منبع زلال حکمت گردانید"

[۲] کتاب خانہ مجلس ۹۸۲ (فہرست غیر مطبوعہ، مرتبہ محمد صادق طباطبائی) یہ نسخہ "خاتمہ خلاصۃ الاشعار" کا انتخاب ہے، جو خود تقی کاشی کے خط میں ہے، جیسا کہ ذیل کی عبارت[۳] سے صاف ظاہر ہے :

---

[۱] ورق ۶۱۴ [۲] ایضاً [۳] ص ۵۱۷

"تمت الانتخاب من جملہ خاتمہ کتاب خلاصۃ الاشعار وزبدۃ الافکار علی ید مولفہ ومصنفہ ومنتخبہ اقل عبادات الملک الغنی تقی الدین محمد بن شرف الدین علی الحسینی فی رابع عشر شہر جمادی الآخری ..... من المایۃ الحادی عشر من ہجرۃ النبویۃ فی بلدۃ المومنین کاشان حماہا اللہ تعالیٰ عن آفات الزمان وتغیر الدوران بحق محمد وآلہ المعصومین"

اس کے بعد خود تقی نے ۱۱ سطر کا ایک قطعہ لکھا ہے[1]، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

لواحدٍ من القدما

دریں سفینہ نگہ کن بچشم معنی بیں | کہ رشک لعبت مانی وصورت چین ست

بدقسمتی سے یہ نسخہ اول اور درمیان سے ناقص ہے، اور دفعۃً محتشم کاشانی کی حسب ذیل بیت سے شروع ہوتا ہے:

د آن نظم مدح نکتہ ستا سے بود کہ او | از ہر نکتہ داں دل وکف بحر وکاں دہد

اس نسخہ کے اجزا یہ ہیں:

اصل اول، کاشان کے ذیل کے ۱۰ اشعرا کے حالات (ص ۱ - ۲۰۶)

(۱) محتشم (حالات محذوف ابتدا ناقص) ..... انتخاب اشعار قصائد و غزلیات (بترتیب حروف تہجی) ۱ - ۸۰ - ص ۸۰ کے بعد کے چند ورق غائب ہیں، محتشم کی ردیف ل کی ابتدائی غزل کے دو شعر کے بعد دوسرا شاعر آجاتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ردیف م، ن، و، ہ، ی کی تمام غزلیں نہیں ہیں،

(۲) حیدر رفیعی معمائی[2] (حالات محذوف) صرف اس کے ۲۳ اشعار منقول ہیں

---

[1] ص ۱۱۵ [2] چونکہ "خاتمہ" میں محتشم کے بعد رفیعی کے حالات ہیں، اس لیے ان دونوں کے درمیان کسی اور شاعر کا وجود تسلیم نہیں ہو سکتا.

اور ۸۱ صفحہ پر دفعۃً یہ بیت پائی جاتی ہے:

خاکپایزا سر کیوان از سجود آذرت | افسر خورشید جمشید فلک خاک درت

(۳) مرزا حسابی ص ۸۲

(۴) فہمی ص ۹۲

(۵) تشبیہی ص ۱۱۸ - ۱۲۴، اس صفحہ کے بعد اوراق غائب ہیں، کیونکہ اگلا صفحہ دفعۃً اس طرح شروع ہوتا ہے:

نظم ترتیب داد شعر ۵ غضنفر کلجاری الخ

(۶) غضنفر[1] (ابتدا ناقص) ۱۲۵ - ۱۳۷

(۷) حاتم (ص ۱۳۷) (۸) حسرتی (ص ۱۵۵) (۹) رضائی (ص ۱۷۳) (۱۰) شجاع (ص ۱۸۶)

اصل دوم "در ذکر شعرائے دار السلطنت صفاہان ودریں اوراق یک کس مذکور میشود" (ص ۲۰۴ - ۲۲۵)

(۱) قاضی نورالدین (ص ۲۰۴)

اصل سوم۔ شعرائے قم (ص ۲۲۵ تا ۲۹۶)

(۱) ملک (ص ۲۲۵) (۲) والہی (ص ۲۳۶) (۳) علی نقی کمرہ (ص ۲۴۸)

(۴) شانی (ص ۲۷۰) (۵) رشکی ص ۲۸۸ - ۲۹۶

اصل نہم[2]۔ شعرائے شیراز (۲۹۶ - ۳۳۴)

(۱) غیرتی (ص ۲۹۶)

---

[1] "خاتمہ" کے نسخے سے مقابلے پر معلوم ہوا کہ یہاں کسی اور شاعر کا حال نہیں ہو سکتا [2] نسخہ ناقص نہیں ہے خود مصنف نے "اصل چہارم تا ہشتم" کے کسی شاعر کا انتخاب نہیں کیا،

(۲) عرفی (۳۰۷ - ۳۴۴)

اصل یازدہم، شعرائے رے واستر آباد (ص ۳۴۴ - ۴۷۹)

(۱) قاسم بیگ حالتی (ص ۳۴۴) (۲) سحابی (ص ۳۶۱) (۳) صالحی[1] (ص ۳۶۸)
(۴) ظہوری (ص ۳۷۵) (۵) اقدسی (۴۱۷) (۶) محمد ہاشم مروی (ص ۴۲۹) (۷) نسبتی (ص ۴۳۴)
(۸) صبوحی (۴۳۹) (۹) امین ذوقی (ص ۴۴۲) (۱۰) سید محمد جامہ باف (ص ۴۴۵)
(۱۱) شیخ رباعی (ص ۴۶۱) (۱۲) مخلصی (ص ۴۶۸)

"لاحقہ در ذکر بعضے از شعرائے متفرقہ کہ دریں سفینہ حسب الارادہ مسود ایں اوراق نوشتہ شد" (ص ۴۷۹ - ۵۰۱)

(۱) شیخ عبدالسلام (ص ۴۷۹)
(۲) جلبی بیگ (ص ۵۰۱)

فائدہ۔

(۱) مولانا امیر محمد باقر اشراق (تا ص ۵۱۷) اور اسی پر نسخہ تمام ہو جاتا ہے،

حجم: ۵۱۷ صفحہ، سائز: ۷، ½ × ۵، خط نستعلیق، ۲۰ سطری، نسخہ نہایت اچھی حالت میں ہے اور اس پر مصنف کی نظر ثانی بھی ہو چکی ہے۔

[۳] نسخہ ڈاکٹر بیانی رئیس کتاب خانۂ ملی تہران، یہ "خاتمہ خلاصۃ الاشعار" کے جزو اول پر مشتمل ہے اور بخط مصنف ہے، مگر بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ناقص الطرفین کے ساتھ ہی بیچ سے بہت سے اوراق غائب ہیں، اور سب سے بڑا ستم ہے کہ نہایت ہی غیر مرتب ہے، اوراق منتشر ہیں، میں نے کئی روز کی مسلسل کوشش اور دوسرے نسخوں کی مدد سے

---

[1] یہ اس کے بعد کے شعرا اصل ۱۲ کے ہیں، مگر یہ نسخہ ناقص بھی نہیں ہے۔

اس کے منتشر اجزا کو یکجا کرنے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کرلی ہے، جو اس طرح پر ہیں،

اصل اول۔ فصل اول (حسب ذیل ۱۵ کاشانی شاعر[1])۔ [اوراق منتشر]

محتشم (ابتدا ناقص ہونے کی بنا پر حالات زندگی پورے اور کچھ منتخب اشعار محذوف)
قاضی برہان، میر یعقوبی، جمال الدین محمود۔ نظام ہاشمی۔ فہمی۔ غضنفر، مقصود۔ خواجگی عنایت، فخری۔ رکن الدین مسعود۔ حسرتی۔ رضائی۔ شعیب۔ جلال الدین مسعود۔

فصل دوم۔ حسب ذیل شاعر مرحوم کاشان
مولانا شجاع[2] (ناقص الآخر)

اصل دوم۔ فصل دوم۔ اصفہان کے حسب ذیل ۹ زندہ شاعر[3] (اوراق منتشر)
ضمیری، میر باقر اشراق، تاج الدین حسن، ملک معرف، فکری، داعی، درویش غازی، بابا شاہ، شفائی۔

فصل دوم۔ کاشان کے حسب ذیل ۲۴ شاعر[4] (مرحوم)۔ صرف ابتدا ناقص۔
طالب (ناقص)، بہاری، شاہ محمود، مرزا ابراہیم، شاہ میر، صادق، مذاقی، مفلح، فضل اللہ، سالک، حسین ساقی، یقینی، بیری، جلال الدین محمد، آیتی، وحید، مقیمی، حرمی، محمد قاسم رازی، فراقی، حلمی، قاسمی، لوحی، رمزی۔

اصل سوم۔ قم کے ذیل کے ۷ شاعر[5] (اوراق منتشر)
حضوری، والہی، سلطان محمد، عارضی، اصلی، انصاری، وحیدی

اصل چہارم۔ ساوہ کے حسب ذیل ۱۲ شاعر[6] (اوراق غیر مربوط)

---

[1] خاتمہ میں ۲۸ شاعر اور ہیں، اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سب کے سب اس میں تھے یا کچھ محذوف ہو گئے تھے کیونکہ وہاں محتشم کے بعد رفیعی ہے اور یہاں باقر۔ [2] خاتمہ میں ۷ شاعر ہیں [3] خاتمہ میں ۲۰ شاعر ہیں [4] صرف ایک شاعر محذوف ہو گیا [5] خاتمہ میں ۱۲ شاعر ہیں [6] ۱۱ شاعر محذوف

حریفی۔ احدی۔ سوزنی۔ صرفی۔ جدائی۔ ظریفی، پیردی۔ قدسی۔ باذلی۔ کمالی، تیری، منصوری

اصل پنجم۔ قزوین کے ۱۳ شاعر [1] (اوراق منتشر)

ابراہیم مرزا، مصطفیٰ مرزا، حسن مرزا، مرزا سلطان، مرزا جعفر، تجلی، فروغی، شرمی، درویش کا، حاجی بیگ، فیضی، حیرتی، ہاتفی۔

اصل ششم۔ گیلان کے ۱۴ شاعر [2] (اوراق منتشر)

اصل ہفتم۔ تبریز کے ۳۰ شاعر [3]۔

حجم: ۲۵۳ ورق۔ سائز: بڑی، ۲۶ سطری، خط نستعلیق۔ ہر صفحہ میں شعر کے لیے ۴ کالم۔ اگرچہ کاتب کا نام نہیں ہے، مگر اسکا وہی خط ہے جو اس کے پہلے نسخے کا ہے۔ سرمو فرق نہیں۔

[۴] نسخہ کتاب خانہ ملک نمبرہ ۴۰۷۸۔ یہ "خاتمہ خلاصۃ الاشعار" کا انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ جس میں ہندوستان کے دو شاعروں یعنی فیضی فیاضی اور نامی بکری سے کچھ خصوصیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ چونکہ خاتمہ میں ایران کے شعرا کا حال جغرافیائی ترتیب سے ہے اس لیے ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کا اس میں ذکر نہیں ہو سکتا تھا، اس لحاظ سے نسخۂ زیر نظر کو خاتمہ ہی کا انتخاب نہ سمجھنا چاہیے۔ بہر حال یہ نسخہ خود مولف ہی کے ایما سے مرتب ہوا، اور اگرچہ اس کے کاتب کا نام معلوم نہیں، لیکن اس قدر ضرور ہے کہ خود تقی کاشی یعنی مولف خلاصۃ الاشعار نے اس پر نظر ثانی اور جا بجا حک و اصلاح بھی کی ہے۔ اس میں حسب ذیل شعرا کے حالات معہ انتخاب اشعار پائے جاتے ہیں۔ مقدمہ بالکل نہیں نسخہ فیضی کے حالات سے دفعۃً شروع ہو جاتا ہے۔

۱۔ فیضی ۲۔ امیر معصوم نامی بکری ۳۔ عرفی ۴۔ ظہوری ۵۔ نظیری

۶۔ اقدسی ۷۔ جلال الدین حسن ۸۔ شفائی ۹۔ شکیبی ۱۰۔ ثنائی

۱۱۔ قاسم بیگ حالتی ۱۲۔ شہابی ۱۳۔ مومن حسین یزدی

---

[1] ۱۱ شاعر محذوف۔ [2] خاتمہ میں ۱۰ شاعر ہیں۔ [3] خاتمہ میں ۴۰ شاعر ہیں

اس لحاظ سے بھی یہ نسخہ مجلس والے نسخہ "انتخاب" سے ممتاز ہے کہ ان شعرا کے حالات شہروں کے اعتبار سے ترتیب نہیں دیے گئے ہیں، اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ ابو الفیض فیضی خلف ارجمند و فرزند سعادت مند جناب شیخ مبارک الخ

آخر کتاب میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

قابل اصلہ حررہ مولفہ تقی الدین محمد الحسینی فی ۱۰۱۴ھ۔

یہ تحریر بالکل وہی ہے جو انتخاب خاتمہ (مجلس) اور خاتمہ (دکتر بیانی) کی ہے۔ اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اس پر مصنف نے نظر ثانی کی تھی۔ سنہ تاریخ میں ایک نقطہ زائد جو غالباً سنہ کی سین کا ہے، اور اس اعتبار سے نظر ثانی کی تاریخ ۱۰۱۴ھ قرار پاتی ہے، اور سنہ کتابت اس سے قبل ہوگا۔

آخری نسخہ پر کسی دوسرے خط میں یہ تحریر پائی جاتی ہے:

"حرضہ سیادت و نقابت پناہ وحید الزمانی فرید الدورانی امیر تقی الدین محمد۔۔۔

این نسخہ را از اصل خود انتخاب نمودہ"

شفائی کے حالات کے بعد ہی تقی نے لکھا ہے:

بنابریں مقدمات دریں اوقات راقم ایں حروف بعد از اتمام ایں نسخہ ناداردرا زدا[شتن] قلم از ذکر شعرائے تازہ ایں روزگار بار دیگر قلم مشکیں رقم را از چشمۂ دوات رطب اللسان ساختہ اسم نامی حکیم زادہ بالغ طبیعت را اضافہ ایں کتاب دلکش و قلادہ ایں عقد بینش گردانیدہ و باوجود آنکہ چند نسخہ ازیں خلاصہ باطراف عراق و خراسان رفتہ بود و الحال اضافہ مستحسن نمی نمود ایں اشعار منتخب آنجناب را بہنر از در۔۔۔۔۔ بنظر ناظران رسانید۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ شفائیؔ کے حالات بعد کا اضافہ ہیں، لیکن اس کا تعلق اس خاص نسخہ سے نہیں ہے، بلکہ خاتمہ خلاصۃ الاشعار کے دوسرے ایڈیشن سے ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیشن میں حکیم کے حالات شامل نہ تھے، دوسرے ایڈیشن میں شامل ہوئے۔

حجم: ۲۱۸ ورق، خط نستعلیق، ۲۷ سطری۔ نہایت دیدہ زیب ہے۔

تہران ہی میں حسب ذیل دو نسخوں کے وجود کا اور پتہ چلتا ہے، بد قسمتی سے ابھی ان تک رسائی نہ ہو سکی۔

۱۔ نسخہ ڈاکٹر عباس اقبال اشتیانی، اس نسخہ کے متعلق یہ خبر سنی ہے کہ یہ بھی مصنف کے خط میں ہے، اور "خاتمہ" پر مشتمل ہے، پورا نہیں ہے، یعنی مقدمہ اور ۴ رکن نہیں ہیں، آجکل وہ ایران سے باہر ہیں، اس لیے فی الحال یہ نسخہ دسترس سے باہر ہے۔

۲۔ نسخہ آقاے صادق انصاری۔ اس کی بابت ڈاکٹر صادق کیا نے اپنی کتاب "نقطویان یا پسیخانیان" (ص ۱۳ ج ۳) میں یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے۔

"نسخہ ای از بخشی کہ از دورہ ہاے پیش ازیں زمان (قرن دہم و یازدہم) است آقاے صادق انصاری دارند۔"

ایران کے مختلف کتاب خانوں میں اچھے اچھے نوادر موجود ہیں، انشاء اللہ ان پر دوسری فرصت میں لکھا جائے گا۔

ادبیات

غزل

از جناب شفیق جونپوری

مجھ سے بڑھکر بھی ہو رحمت کا سزاوار کوئی
تیرے بندوں میں نہیں مجھ سا گنہگار کوئی

ناز بیجا یہ نہیں جرأتِ حق گوئی پر
جان کو بیچ کے پہنچا ہے سرِ دار کوئی

خانقاہوں کی روش دیکھ کے دل کہتا ہو
چل کے آباد کرو خانۂ خمار کوئی

بے اصولی کا ہے دور، وہ کہ اللہ کی پناہ
آج آزاد ہے کوئی نہ گرفتار کوئی

قدر کلیوں کی نہ پھولوں کا چمن میں رتبہ
جیسے رکھتا ہی نہیں دیدۂ بیدار کوئی

اصطلاحاتِ محبت کی ہیں باتیں واعظ
ورنہ معصوم ہے کوئی نہ گنہگار کوئی

سچ تو یہ ہے کہ مرے پیرِ خرابات کے بعد
نہ ہوا سرِ حقیقت سے خبردار کوئی

سب مرے کفرِ تمنا سے خفا ہیں یارب
دیکھتا بھی تو جمالِ بتِ عیار کوئی

مجلسِ وعظ میں کیا زندہ دلی پیدا ہو
رند پُر جوش، نہ بدمست، نہ سرشار کوئی

بتکدہ تیرا پرستار، حرم کشتۂ ناز
ابتو باقی نہ رہا اے نگہ یار کوئی

جھومتی آتی ہے گھنگھور گھٹا اے ساقی
جس طرح پی کے چلے رند قدح خوار کوئی

نگہ مست کی تقوا شکنی کیا کہیے
جس کی زد سے نہ بچا کافر و دیندار کوئی

چال آفت، قدِ رعنا پہ قیامت صدقے
جیسے سرتا بقدم فتنۂ بیدار کوئی

وہ نکلتے ہیں تو عصمت یہ صدا دیتی ہو
اس طرف آنکھ اٹھائے نہ خبردار کوئی

طاق ابرو میں تری زلف رسا کا سجدہ
سر جھکائے ہوئے کعبے میں سیہ کار کوئی

گر پڑا قیس، تو فرہاد نے ٹھوکر کھائی
کر سکا راہ محبت کو نہ ہموار کوئی

مجھ سے پوچھے کوئی اجڑے ہوئے گھر کا عالم
لے گیا جب بہا درو دیوار کوئی

فتح خیبر کی کہانی تو رہی یاد شفیق
پھر جہاں میں نہ ہوا حیدر کرارؓ کوئی

غزل

از جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری

نہ سکون دل کی ہو جستجو نہ قرار جاں کی تلاش ہے
غم عشق ہے مرا مدعا غم جاوداں کی تلاش ہو

ترا در ہے قابل بندگی ترا در ہو حاصلِ زندگی
مجھے ذوق سجدہ تو مل گیا ترے آستاں کی تلاش ہو

مری خام کاری شوق نے مجھے کشمکش میں پھنسا دیا
کبھی ضبط غم کی ہیں کوششیں کبھی رازداں کی تلاش ہو

جسے ڈھونڈتا ہوں چمن چمن وہ کہاں گئی مری انجمن
ہیں قفس سے چھٹکے ہوں بے وطن مجھے آشیاں کی تلاش ہو

مری آرزو ہو ابھی جواں مری جستجو کو سکوں کہاں
کبھی اس جہاں کی تلاش ہو کبھی اُس جہاں کی تلاش ہو

نہ ہو شورشِ غم دو جہاں تو نفس نفس ہو وبال جاں
مری راہ ایسے ہیں وہ بوالہوس کہ جنھیں اماں کی تلاش ہو

مجھے اب بھی جوہر بے وطن ہے عزیز دل سے وہ انجمن
جہاں لٹ گیا مرا آشیاں اسی گلستاں کی تلاش ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

حیات آفتاب - مرتبہ جناب ڈپٹی حبیب اللہ صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۵۰۴ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ پتہ: دفتر اولڈ بوائے ایسوسی ایشن، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم علی گڈھ کے سلسلہ کے ممتاز اکابر میں تھے، ان میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا بڑا جذبہ خصوصاً ان کی تعلیم کے مسئلہ سے بڑی دلچسپی تھی، اس کو انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین اور تعلیمی خدمت کے لیے اس کے مرکز علی گڈھ کو اپنا وطن بنا لیا تھا، اور وہ ابتدا سے آخر عمر تک کسی نہ کسی حیثیت سے علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے، مسلم یونیورسٹی کے قیام میں ان کی کوششیں بھی شامل تھیں، آخر میں اس کے وائس چانسلر بھی ہوگئے تھے، ایک عرصہ تک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری رہے، اور اپنے دور میں ان دونوں کو مختلف حیثیتوں سے ترقی دی، یونیورسٹی کا اصلاحی کمیشن ان کا بڑا کارنامہ ہے، وہ عملاً دیندار تھے، اس لیے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم سے بھی دلچسپی تھی، مسلم یونیورسٹی کی مذہبی اصلاح کی بھی انھوں نے کوشش کی، تعلیم کے علاوہ مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے دوسرے مسائل میں بھی وہ حصہ لیتے تھے، حکومت کے سامنے ان کی وکالت کرتے تھے، انھوں نے مختلف قومی و ملی تحریکوں کی رہنمائی کی، غرض اس زمانہ کے مسلمانوں کے بیشتر اہم معاملات میں ان کی امداد و اعانت شامل رہتی تھی، اگرچہ وہ ایک زمانہ تک نیک نیتی سے نئی تعلیم و تہذیب کے بڑے حامی رہے، اور اس کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے، لیکن سیاست میں علی گڈھ کی روایات کے خلاف آزاد خیال تھے، سودیشی تحریک

کے شروع سے حامی اور اس پر عامل بھی تھے، انڈیا کونسل کی ممبری کے زمانہ میں ہندوستان کے مفاد
کی پرزور وکالت کرتے تھے، غرض ان کے خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اخلاق وسیرت کے
لحاظ سے بھی بلند شخصیت رکھتے تھے، علی گڈھ کے قریب قریب تمام اکابر کی سوانح عمریاں لکھی جا چکی
ہیں، صاحبزادے صاحب کی سوانح نگاری کا فرض ان کے دیرینہ رفیق جناب ڈپٹی حبیب اللہ
صاحب نے کئی شرکاء کی مدد سے انجام دیا ہے، اس میں صاحبزادے صاحب کے ذاتی حالات انکے
اخلاق وسیرت اور ان کے کارناموں کی پوری تفصیل ہے، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی نصف صدی
کی تعلیمی سرگذشت اور اس دور کے اور بہت سے اہم واقعات آگئے ہیں، ان مختلف النوع واقعات
و مسائل میں صاحبزادے صاحب کے ہر مسلک اور مصنفین کی تمام رایوں سے اتفاق ضروری نہیں ہے، لیکن
مجموعی حیثیت سے یہ کتاب قابل قدر اور ہماری موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لیے بڑی سبق آموز ہے،
اس سے ظاہر ہوگا کہ ہمارے پرانے لوگ مسلمانوں کی جو خدمات انجام دے گئے ہیں موجودہ نسل سے جو
اپنے کو ان سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھتی ہے، اس کا عشر عشیر بھی ہونا مشکل ہے،

ابن الحریری ومقاماتہ - از جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی استاد شعبۂ عربی،
الہ آباد یونیورسٹی، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت اعلیٰ،
قیمت مجلد عہ ر، مصنف سے ملے گی۔

لائق مصنف بیک وقت ڈاکٹر بھی ہیں اور مولانا بھی، انھوں نے عربی کی پوری تعلیم حاصل
کرنے کے بعد انگریزی پڑھی اور اس میں بھی درجۂ فضیلت حاصل کیا، اور اس سے بڑھکر تعجب کی بات
یہ ہے کہ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے باوجود ان کی "مولویت" میں کوئی فرق نہیں آیا، جس کی مثالیں کم
ملتی ہیں، انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے عربی ادب کی مشہور نصابی کتاب مقامات حریری پر عربی
میں مقالہ لکھا تھا، اب اس کو انھوں نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس میں مقامات

اور اس کے مصنف پر تحقیقی بحث کی گئی ہے، پہلے ابن الحریری کے حالات ہیں، اس کے بعد مقامات
حریری پر بحث ہے، اس سلسلہ میں مقامات کی تاریخ اور اس کے مصنفین کا تذکرہ ہے، اور
مقامات حریری کی ادبی و لغوی خصوصیات اور اس کی صناعیوں وغیرہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی
ڈالی گئی ہے اور ضمناً اسکے نقائص کا اجمالی ذکر اور اس کے اسلوب پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے،
اور مقامات بدیعی سے اس کا موازنہ کرکے حریری کے ترجیحی پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے، اور اس پر
الفخری اور دوسرے ناقدین کی تنقیدوں کا جواب دیا گیا ہے، آخر میں مقامات حریری کے متعلق
مشہور ادیبوں کی رائیں نقل کی گئی ہیں، اور عربی ادب و ثقافت پر اس کے اثرات دکھائے
گئے ہیں، مصنف نے یہ مقالہ محنت اور کاوش سے لکھا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ لغت کے ذخیرے
اور ادبی صناعیوں کے لحاظ سے مقامات حریری ادب کی بلند پایہ کتابوں میں ہے، اور عربی
ادب کے نصاب کا جزو لاینفک ہے، لیکن فصیح عربی زبان سے اس کو نسبت نہیں، اس سے
لغات کا ذخیرہ ضرور حفظ ہو جاتا ہے، اور ادبی صناعیوں پر بھی نظر ہو جاتی ہے، لیکن عربی
زبان کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہوتا، یہ درحقیقت اس دور کی تصنیف ہے جبکہ ادبی صناعی اور
لفظی بازیگری ادب و انشاء کا کمال سمجھی جاتی تھی، اور یہ عربی کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی زبان
کی تاریخ بھی اس سے خالی نہیں ہے، لیکن مصنف کی محنت و کاوش بہر حال قابل تحسین ہے،
انھوں نے اس مقالہ میں عربی ادب کے متعلق بہت سے مفید اور محققانہ معلومات جمع کر دیے ہیں،
جس سے اس کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں،

باپو کے قدموں میں - ڈاکٹر راجندر پرشاد، صدر جمہوریہ ہند، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۲۰ صفحات،
کاغذ اعلیٰ، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت تحریر نہیں، انجمن ترقی اردو علی گڈھ سے ملے گی،
ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد گاندھی جی کے ان عقیدتمند رفقا میں ہیں جو ابتدا سے قومی اد

وطنی تحریکوں میں انکے شریک کار اور معاون و مددگار رہے، ان سے انکی پہلی ملاقات بہار کی ستیہ گرہ میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی، اسوقت سے لیکر آخر تک وہ ایک عقیدتمند کارکن کی حیثیت سے ہر کام میں گاندھی جی کیساتھ رہے، اور اس راہ کی تمام آزمائشوں اور تکلیفوں کو برداشت کیا، اس پوری سرگذشت کو انھوں نے غالباً انگریزی میں لکھا تھا، مذکورۂ بالا کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے، اس میں ہندوستان کی جنگ آزادی کی پوری تاریخ آگئی ہے، آخر میں ہندوستان کی تقسیم اور اس کے نتائج کا بھی ذکر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو خود اس جنگ میں ایک سرفروش مجاہد کی حیثیت سے شریک رہا، اسلیے یہ کتاب جنگ آزادی کی مستند ترین تاریخ ہے۔

ڈھائی ہفتہ پاکستان میں ۔ از جناب مولانا شاہ عبد الماجد صاحب دریابادی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۳۸ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ،

ایک سال سے زیادہ ہوا، مولانا شاہ عبد الماجد صاحب دریابادی نے سابق گورنر جنرل پاکستان غلام محمد صاحب کی دعوت پر کراچی کا سفر کیا تھا، اور ان ہی کے مہمان ہوئے تھے، درمیان میں دو چار دن لاہور بھی ٹھہرے تھے، اس سفر کی رُوداد پہلے انھوں نے صدق میں شائع کی تھی، اب کتابی صورت میں شائع کی ہے، مولانا نے اس سفر کو محض اعزہ و احباب کی ملاقات تک محدود رکھا تھا اور سیاسی معاملات، ملکی مسائل، پبلک جلسوں حتیٰ کہ علمی تقریبات میں شرکت سے بھی احتراز کیا تھا، اسلیے یہ سفرنامہ زیادہ تر اعزہ و احباب، مختلف طبقوں کے اکابر، خصوصاً علمی و ادبی برادری کے اشخاص کی ملاقات، ان کے متعلق تاثرات اور دعوتوں اور پارٹیوں کے حالات پر مشتمل ہے، اسکے علاوہ سفر کے بعض تجربات لاہور اور کراچی کے دوران قیام کے قابل ذکر واقعات، پاکستان کے بعض دینی و اخلاقی پہلوؤں اور وہاں کی صوبائی عصبیت اور پارٹی بندیوں کے متعلق بھی جذبات و تاثرات اور خیرخواہانہ مشورے ہیں، اس طرح یہ ایک ہلکا پھلکا سفرنامہ ہے، مگر مولانا کے مخصوص طرز انشاء نے اس کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے، اور اس حیثیت سے وہ اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

"م"